جلد ۷۲ نومبر ۱۹۶۹ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

اس شمارے کی قیمت

مغربی پاکستان
فی پرچہ ۸۵ پیسے

مشرقی پاکستان
فی پرچہ ۹۵ پیسے

خالی صفحه

ترجمانُ القرآن، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۷۲	نومبر ۱۹۶۹ء مطابق شعبان المعظم ۱۳۸۹ھ	عدد ۳

—مغربی پاکستان—		—مشرقی پاکستان—
چندہ سالانہ سات روپے	ماہنامہ ترجمان القرآن	ہوائی ڈاک سے ۸ روپے
قیمت فی پرچہ: ۷۵ پیسے	۵-اے ذیلدار پارک اچھرہ لاہور	فی پرچہ: ۸۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلیشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ- لاہور سے شائع کیا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

(ان اشارات کا ایک حصہ ترجمان القرآن کے پچھلے شمارے میں شائع ہو چکا ہے)

روس کی اشتراکی حکومت کی اسلام دشمن پالیسی کو دیکھتے ہوئے صاف نظر آتا ہے کہ اسے اسلام اور مسلمانوں کا وجود کسی شکل میں بھی گوارا نہ تھا اور اسے شروع ہی سے اس بات کی فکر دامنگیر تھی کہ جب تک انہیں بالکل ملیامیٹ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک اشتراکیت کا درخت برگ و بار نہیں لا سکتا۔ اسی مقصد کی خاطر روسی حکومت ہمیشہ اس موقع کی تلاش میں رہی ہے کہ کسی طرح مسلم اکثریت کے علاقوں میں غیر مسلموں کو اس انداز سے بسایا جائے کہ یا تو مسلمانوں کی اکثریت باقی نہ رہے یا وہ اپنے گھر میں بھی بالکل غیر مؤثر اور بے وزن بن کر رہ جائیں اور عنانِ اختیار یا توازنِ اقتدار عملاً غیر مسلموں کے ہاتھ میں منتقل ہو جائے۔

دوسری طرف مسلمانوں کے اندر اشتراکیت کے اثر و نفوذ کے بعد بھی اپنی الگ قومیت کا احساس کسی نہ کسی صورت میں باقی رہا اور وہ ابتدائی چند سالوں میں اس غلط فہمی کے شکار رہے کہ اگر وہ اشتراکیت کے معاشی پروگرام کو اپنا لیں تو زندگی کے باقی معاملات میں اشتراکی ان سے تعرض نہ کریں گے اور وہ اشتراکی نظام کے اندر بھی اپنے قومی تشخص کو برقرار رکھ سکیں گے۔ اشتراکیت کے بارے اس خوش فہمی کے زیر اثر، یا اپنے قومی وجود کے تحفظ کی خاطر روس کی مسلم ریاستوں میں بسماچی تحریک بڑے زور شور سے اٹھی۔ اشتراکیت کے علمبردار اپنے ناقابلِ بیان مظالم پر پردہ ڈالنے کے لیے اس تحریک کے بارے میں یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ یہ اشتراکیت کے خلاف ایک بغاوت تھی۔ حالانکہ یہ بات حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ اس تحریک کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہ تھا کہ وسط ایشیا کی مسلمان قومیں، جو ایک ہی نسل سے تعلق رکھتی ہیں اور ایک

ہی قسم کی تہذیبی روایات کی حامل ہیں، ان کے درمیان مستقل طور پر رابطہ رہے اور ان کا الگ قومی وجود کسی طرح برقرار رکھا جا سکے۔ مگر اشتراکیت کو مسلمانوں کا یہ نسلی اور تہذیبی اتحاد بھی گوارا نہ تھا اس لیے انھوں نے اس اتحاد کو بھی پوری قوت کے ساتھ منتشر کرنے کی کوشش کی۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ایک عجیب وغریب چال چلی۔ مسلمانوں کو اور پوری دنیا کو یہ تاثر دیا کہ جمہوریتوں میں زرعی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک یورپی روس کے ماہرین کو اس انقلاب کی غرض سے مسلمان آبادیوں میں بسایا نہ جائے۔ مگر یہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ اس کی اصل غرض یہ تھی کہ مسلم اکثریت کے علاقوں کو مخلوط آبادیاں بنا دیا جائے تاکہ ان کے اندر اپنے الگ قومی وجود کا احساس یکسر ختم ہو جائے۔ وسطی ایشیا کے ترکستانی اور تاتاری، اشتراکی انقلاب کے وقت جس غلط فہمی کے شکار تھے اس کا اندازہ سٹالن کے ایک بہت بڑے ساتھی ملانور کے ان احساسات سے لگایا جا سکتا ہے جنہیں ایک تاتاری مصنف ... کا لیموف ان کا تذکرہ کرتے ہوئے اس طرح لکھتا ہے:

> "ملانور کو اس بات کا یقین تھا کہ اشتراکیت کے مطابق دنیا کی تعمیرِ نو کے بعد عرب تہذیب کا پوری دنیا کے تمدن پر نہایت گہرا اثر مرتب ہوگا۔ وہ تصورات کی دنیا میں کھو کر اسلامی تہذیب کے اثرات کا عرب سے لے کر ہندوستان کے پوِتر دریائے گنگا تک کا جائزہ لیتے رہتے تھے۔ انہیں اس کے مکمل انتشار بلکہ اس کے یکسر معدوم ہونے کا ذرہ برابر بھی احساس نہ تھا۔"[1]

یہ مسلمان اشتراکی اس زعم میں گرفتار تھے کہ اس انقلاب کے ثمرات کا بیشتر حصہ اُن کی جھولی میں گرے گا۔ چنانچہ ایک تاتاری مصنف سلطان گالیف (SULTAN GALIEV) نے اپنے ایک مضمون "قومیتوں کی زندگی" کے عنوان پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا کہ اسلامی مشرق ہی انقلاب کی فتح مندی کی ضمانت ہے۔ تاتاری مشرق اور اسلام ہی صحیح معنوں میں انقلابی قوتیں ہیں اور ان کا بنیادی مقصد پوری دنیا میں انقلاب

---

[1] PAN TURKISM AND ISLAM IN RUSSIA —P.182

برپا کرنا نہیں بلکہ یورپی سامراجیوں سے نجات حاصل کرنا ہے[۱]۔ روسی اشتراکیوں نے بڑی چالاکی اور عیاری سے مسلمانوں کو اس طرح اپنے ساتھ شامل کر لیا کہ وہ یہ سمجھنے لگے کہ یہ ساری جدوجہد ان کی آزادی اور ان کے تہذیبی اور قومی تحفظ کے لیے کی جا رہی ہے۔ چنانچہ ان مسلمانوں نے اشتراکیت کا ہراول دستہ بن کر خود ہی اپنے آپ کو برباد کیا۔ جب انقلاب آچکا اور ان مسلمان کمیونسٹوں نے حق خود ارادیت کا نام لیا تو سٹالن نے ان کی اس جسارت پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور انہیں واضح طور پر بتایا کہ ان کا یہ مطالبہ کسی صورت بھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ سٹالن نے مسلمانوں کو جن الفاظ میں متنبہ کیا ہے وہ آج بھی اس کی تقریروں میں موجود ہیں۔ ہم یہاں ان کا ایک حصّہ نقل کرتے ہیں:

> "یہ نیم مختار گروہ (میری مراد تاتاریوں سے ہے) جنہوں نے اپنی قومی کونسلیں قائم کر رکھی ہیں۔ اپنے لیے اس نوعیت کی آزادی کا مطالبہ کر رہے ہیں کہ مرکزی حکومت ان کے معاملات میں دخل نہ دے اور وہ اپنے مسائل خود طے کریں۔ مگر میں یہ بات بڑے واشگاف الفاظ میں کہنا چاہتا ہوں کہ سوویٹ حکومت اس نوعیت کی آزادی کبھی نہیں دے سکتی[۲]۔"

روسی اشتراکیوں نے پہلے تو مسلمان کمیونسٹوں کے ہاتھوں مسلمانوں کے اس عاقبت اندیش اور دیانتدار طبقے کو برباد کروایا جو اشتراکی انقلاب کے مضمرات کو دینی اور ملی نقطۂ نظر سے اچھی طرح جانتا تھا اور اس کے جلو میں آنے والی تباہ کاریوں کا اپنی بصیرت کی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا تھا۔ پھر جب اس دین پسند طبقے کی راکھ اڑا دی گئی تو اشتراکیت کے علمبردار ان مسلمان کمیونسٹوں کی طرف متوجہ ہوئے جو مسلم اکثریت کی ریاستوں کے لیے داخلی آزادی کے خواہاں تھے اور تہذیبی اعتبار سے اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے آرزومند نظر آتے تھے۔ یہ بدنصیب مسلمان کمیونسٹ جس کرب و اضطراب کے ساتھ اپنی نسل

---

[۱] بحوالہ صفحہ سابق

[۲] PAN TURKISM AND ISLAM IN RUSSIA P. 183

اور قوم کی بربادی دیکھ رہے تھے اسے ایک شاشانی کمیونسٹ حسن اسرائیلوف کے مندرجۂ ذیل مراسلہ میں دیکھا جا سکتا ہے جو اس نے ۱۹۳۹ء میں روسی حکام کو لکھا تھا :

" روسی حکومت پچھلے بیس سالوں سے طرح طرح کے حیلوں بہانوں سے میری قوم کو فنا کرنے کی کوشش کرتی رہی ہے۔

میری قوم پر کبھی یہ الزام لگایا گیا کہ یہ جاگیردار ہیں۔ کبھی یہ کہا گیا کہ یہ سرمائے کی تجوریاں لے کر بیٹھے ہوتے ہیں اور ان لوگوں پر ڈاکو اور رہزن ہونے کا الزام دہرایا گیا۔ کبھی یہ درمیانہ طبقہ کے وطن پرست قرار دیئے گئے۔ لیکن اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ سب کچھ میری قوم کو نیست و نابود کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ چنانچہ مَیں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ مَیں اپنا سب کچھ اپنی قوم کی آزادی کی خاطر قربان کر دوں گا۔ مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ صرف شاشان اور انگوش ہی نہیں بلکہ تمام قفقاز (کاکیشیا) کو سرخ استعمار کے چنگل سے نجات دلانے کے لیے بڑی کٹھن مشکلات کا سامنا کرنا ہو گا "

اس اقتباس کو بار بار پڑھیے اور تاریخ کے آئینے میں ذرا ان مسلمانوں کا حشر دیکھیے جو اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اسے مغربی استعمار سے نجات کا ایک مؤثر ذریعہ سمجھ بیٹھے تھے اور اس بات کی توقع رکھتے تھے کہ یہ انقلاب انہیں باہم متحد ہونے میں مدد دے گا۔ مگر جب یہ انقلاب عملاً برپا ہو گیا تو اس نے تاتاریوں اور ترکوں کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا۔ یورپی روس کی غیر مسلم آبادی کو مسلم آبادیوں میں لا لا کر زبردستی آباد کیا گیا تاکہ ان کی یک جہتی ٹوٹے۔ مثلاً تاجکستان، ترکمانستان اور کرغیزستان میں غیر مسلم باشندوں کی جو تعداد ۱۹۲۶ء میں ۲ لاکھ انیس ہزار تھی وہ ۱۹۵۹ء میں ۴۰۰، ۴۷، ۲۷ تک جا پہنچی۔ ظاہر بات ہے کہ اس تعداد میں اضافے کی وجہ سے مسلم آبادی کا تناسب مسلسل گرنا شروع ہوا۔ ازبکستان میں ازبک آبادی کا تناسب ۷۶ فیصد سے کم ہو کر ۶۲ فیصد ہو گیا۔ اسی طرح ترکمانستان میں ترک آبادی کا تناسب ۱۳ فیصد کم ہوا۔ تاجکستان میں یہ کمی ۳۰ فیصد سے زیادہ تھی۔ کرغیزستان میں مسلم آبادی ۶، ۶۶ فیصد سے کم ہو کر ۵، ۴۰ اور قازقستان میں ۶۰ فیصد سے کم ہو کر صرف تیس فیصد

رہ گئی ہے۔

اسلام، مسلم قوم، اس کی روایات اور اس کے تمدن کا یہ حال صرف روس ہی میں نہیں ہوا بلکہ جس جگہ بھی اشتراکیت کو مسلمانوں کے اندر راہ پانے کا موقع ملا ہے وہاں اسلام کا یہی حشر ہوا ہے۔ روس کی اسلام کش پالیسی اور مسلمانوں پر اس کے بے پناہ مظالم کی مدافعت میں بعض اشتراکیوں کی زبان سے یہ دلیل بھی سننے میں آئی ہے کہ "یہ سب کچھ ایک وقتی جوش کے تحت ہوا ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی طبقوں نے چونکہ اس نظام کی شدید مخالفت کی تھی اس لیے روس میں اشتراکیت کے علمبرداروں نے اسلام اور مسلمانوں کے معاملے میں کسی حد تک زیادتی بھی کر دی۔ مگر اس تجربے کے بعد جب دوسرے ممالک میں اشتراکی انقلاب برپا ہوگا تو ان میں اسلام دشمنی کی یہ شدت ہرگز نہ ہوگی بلکہ اسلام کو زندہ رہنے اور پھلنے پھولنے کے پورے پورے مواقع فراہم کیے جائیں گے۔" یہ محض خام خیالی ہے۔ اشتراکیت اسلام کو ایک ثانیہ کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتی اس لیے دوسرے جن ممالک میں بھی اس نظام کو قدم جمانے کا موقع ملا ہے وہاں اسی طرح اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کی گئی ہے۔

روس کے بعد اشتراکیت کا نہایت منظم تجربہ چین میں کیا گیا۔ یہ ملک ۲۸ صوبوں پر مشتمل ہے جن میں سے تین صوبوں مشرقی ترکستان، کانسو اور ریناآن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ صرف مشرقی ترکستان میں مسلمانوں کی تعداد ایک کروڑ ہے۔

جنگِ عظیم سے پیشتر چین میں مسلمانوں کی مجموعی تعداد کم از کم پانچ کروڑ تھی[له] لیکن چین کی کمیونسٹ

ل STUDIES ON THE SOVIET UNION 1964 P. 28-29

لہ بعض اشتراکی اس تعداد کا بڑا مذاق اڑاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس تعداد کا ماخذ کیا ہے؟ ان لوگوں کی بےخبری بڑی عجیب و غریب ہے۔ یہ تعداد CHINESE YEARBOOK جو شنگھائی ۱۹۳۵ء میں شائع ہوئی درج ہے پھر اس کی تائید بعض دوسرے موثق ذرائع سے بھی ہوتی ہے۔ امیر شکیب ارسلان اپنی کتاب حاضر العالم الاسلامی میں لکھتے ہیں کہ میں نے سوئٹزرلینڈ میں چینی سفارت خانے کے مشیر سے دریافت کیا کہ چین میں مسلمانوں کی تعداد کیا ہے تو

حکومت کی طرف سے ۱۹۶۱ء میں جو رپورٹ شائع کی گئی ہے اس میں چین کی مجموعی آبادی کو ۶۰ کروڑ بتایا گیا اور اس میں مسلمانوں کی کل تعداد صرف ایک کروڑ ظاہر کی گئی ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ۱۹۳۴ء تک تو چین کی آبادی ۴۰ کروڑ ہو اور اس میں مسلمانوں کی تعداد ۵ کروڑ محسوب کی جائے۔ مگر ۱۹۶۱ء میں جب ملک کی آبادی ساٹھ کروڑ تک جا پہنچے تو مسلمانوں کی تعداد صرف ایک کروڑ رہ جائے۔ چین کی آبادی میں جس رفتار سے اضافہ ہوا ہے اس اعتبار سے مسلمانوں کی تعداد کم از کم سات کروڑ ہونی چاہیے تھی۔ آخر وہ چھ کروڑ انسان کہاں غائب ہو گئے؟ کیا انہیں آسمان اُچک لے گیا یا زمین نگل گئی ہے؟ چین اس کا کچھ جواب نہیں دے سکتا۔ چین کے مختلف سفارت خانوں سے اس مسئلے کے بارے میں کئی افراد نے رجوع کیا ہے مگر کہیں سے بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ صرف ایک ہی رٹا رٹایا فقرہ سننے میں آیا ہے کہ یہ سب سفید سامراج کا پروپیگنڈہ ہے۔ یہ سفید سامراج ایک پردہ ہے جس کے پیچھے سرخ سامراج کا ہر عیب چھپ جاتا ہے!

چین کے مسلمانوں کی معاشی، معاشرتی اور دینی حالت بھی نہایت اچھی تھی۔ چودھویں صدی عیسوی میں ابن بطوطہ نے چین کے ساحلی شہروں کے بارے میں اپنے جو تاثرات بیان کیے ہیں اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ چینی مسلمان دینی اعتبار سے بڑے قابلِ تعظیم ہیں۔ انہیں مذہب سے بڑی محبت ہے۔ موجودہ صدی میں امیر شکیب ارسلان اور دوسرے مسلمان مفکرین اور سیاحوں نے چینی مسلمانوں کی اسلام سے گہری محبت کی تعریف کی ہے اور اسے قابلِ رشک قرار دیا ہے۔ خصوصاً سن کیانگ جس کا اصل نام مشرقی ترکستان ہے (مغربی ترکستان روس کے قبضے میں ہے اور مشرقی ترکستان چین کے قبضے میں) کے مسلمانوں کی حالت نہایت اچھی رہی ہے۔ اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اشتراکی انقلاب سے پہلے تک مشرقی ترکستان میں ۳ ہزار ابتدائی مدارس تھے جن میں بچوں کو مفت دینی تعلیم دی جاتی تھی۔ ۶۲ ہائی سکول تھے جو صرف عوامی عطیات کے بل پر چلتے تھے اور اس میں سولہ ہزار طلبہ کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اور نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ترکستان کے نام سے ایک اعلیٰ درجے کا ادارہ تھا جس میں آٹھ سو طلبہ پڑھتے تھے۔ تمام کتابیں ترکی زبان میں شائع ہوتی

اُس نے چھ کروڑ بتائی۔ مشہور پادری بروم ہال BROOM HALL نے ۱۹۱۰ء میں چین میں مسلمانوں کی تعداد تین کروڑ بیان کی ہے۔

تھیں۔ رسم الخط عربی تھا[1]۔ اس علاقے کا مشہور شہر کاشغر اسلامی تہذیب کا بڑا اہم مرکز تھا۔

چینی مسلمانوں کے سلسلے میں یہ بات بھی پوری طرح ذہن نشین رہے کہ روسی اور چینی دونوں مشرقی ترکستان کو ہمیشہ للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتے رہے ہیں اور انہوں نے ہر موقع پر اس امر کی کوشش کی ہے کہ کسی طرح یہ سرسبز و شاداب علاقہ ان کے قبضے میں چلا جائے اور وہاں سے مسلمانوں کو نکال کر ... روسیوں یا چینیوں کو آباد کیا جائے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے روسی اور چینی اقوام میں بہت سے اختلافات کے باوجود پوری طرح اتفاق رہا اور دونوں نے مل کر اس علاقے کو متعدد بار تاراج کیا۔ مگر انہیں کبھی بھی مستقل تسلط کا موقع نہ حاصل ہو سکا۔ مشرقی ترکستان کے غیور مسلمان برابر اپنی آزادی کے لیے سرفروشانہ جدوجہد کرتے رہے۔ اسی ضمن میں مسلمانوں کی طرف سے آخری کامیاب کوشش ۱۹۳۱ء میں ہوئی جس کے نتیجے میں مشرقی ترکستان چینی تسلط سے آزاد ہو گیا اور وہاں ۱۲ نومبر ۱۹۳۳ء کو اسلامی جمہوریہ کا اعلان کر دیا گیا۔ کاشغر اسلامی جمہوریہ کا دارالحکومت قرار پایا اور الحاج خواجہ نیاز صدر اور علامہ ثابت داملا عبدالباقی وزیر اعظم منتخب ہوئے۔

مشرقی ترکستان کو اسلام کا گہوارہ بنے بارہ صدیاں گزر چکی ہیں۔ اس طویل مدت میں کرۂ ارضی پر بڑے بڑے انقلابات آئے، مگر یہ خطہ اور اس کے بسنے والے لوگ اسلامی تعلق کی بنا پر کفر کی نظر میں، خواہ وہ کسی صورت میں جلوہ گر ہوا، ہمیشہ خار بن کر کھٹکتے رہے اور کفر نے اختلافات کے خارجی مظاہر کے باوجود اسلام کو برباد کرنے اور مسلمانوں کو مٹانے کے لیے بڑی یک جہتی کا ثبوت فراہم کیا۔ روس میں اشتراکی انقلاب سے پہلے بھی اس خطہ کو تاخت کرنے کی شدید خواہش موجود تھی اور اسی کے تحت زار کے عہدِ حکومت میں اس پر کئی بار حملے کیے گئے۔ اشتراکی انقلاب کے بعد بھی جس کا دعویٰ کمزور اقوام کو سامراج کے چنگل سے نجات دلانے کا ہے، روس کے اس رویئے میں قطعاً کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ چین کا نیشنلسٹ سامراج بھی اس علاقے کا دشمن تھا۔ اور اب اشتراکی چین بھی اس کی بربادی پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ مسلمانوں کے مقابلے میں کافرانہ

---

[1] ڈاکٹر عبدالرحمن زکی کی کتاب المسلمون فی العالم الیوم، ج ۴، ص ۷۰۔

طاقتوں کے درمیان کس طرح مکمل اتحاد و اتفاق ہے اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشرقی ترکستان کو برباد کرنے کے لیے نہ صرف چین کا نیشنلسٹ سامراج پوری قوت کا مظاہرہ کر رہا تھا بلکہ اس "کارِ خیر میں" غریبوں اور بے کسوں اور مظلوموں کے حامی اشتراکی بھی پوری طرح شریک تھے۔ اشتراکی روس اور اشتراکی چین کو امریکہ کے پروردہ چیانگ کائی شیک اور اس کی نیشنلسٹ حکومت سے جو شدید عداوت اور دشمنی تھی وہ کس سے پوشیدہ ہے۔ مگر مشرقی ترکستان کی اسلامی جمہوریہ کو ملیامیٹ کرنے میں یہ تینوں ایک دوسرے کے مددگار تھے۔

چین کے بہادر مسلمانوں نے اس یلغار کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ مگر ان کی کچھ پیش نہ گئی اور بالآخر ۱۲ نومبر ۱۹۴۹ء کو یہ خطہ ماؤزے تنگ کی فوجوں کے تسلط میں آگیا۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق آزادی کے تحفظ کے لیے ۱۹۵۱ء تک ایک لاکھ بیس ہزار ترکستانیوں نے اپنی جانیں قربان کیں۔ اس خطے پر اشتراکی چین نے قبضہ کرنے کے بعد اسلام کو مٹانے کے لیے وہی حربے اختیار کیے جو روس میں کیے گئے تھے، یعنی الحاد اور بے دینی کو فروغ دینے کی منظم کوشش، مسلم آبادی کا قتل عام اور اس کی ایسے علاقوں کی طرف جلاوطنی جہاں ان کا کوئی وزن باقی نہ رہے۔ مکہ معظمہ کے روزنامہ الندوہ (۱۷ رجون ۱۹۶۸ء) میں ایک ترکستانی مہاجر لکھتا ہے:

"چینی حکومت مشرقی ترکستان کے مسلمانوں پر جو مظالم توڑ رہی ہے اس کی تفصیل بڑی دلخراش ہے۔ صرف ایک مثال سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ حکومت کی طرف سے لازم ہے کہ ہر ترکستانی فرد جو ۱۰ سے لے کر ۴۰ سال تک کے درمیان ہو وسط چین کے بیگار کیمپوں اور منچوریا کے کارخانوں میں کام کرے۔ اسے اپنے بال بچوں کو ساتھ لے جانے کی اجازت نہیں ہے۔ کمیونسٹ حکام مردوں کو جبراً کیمپوں میں بھیج دیتے ہیں اور ان کی لڑکیاں چینی نوآبادکاروں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ نہ لڑکیوں کی آہ و فغاں پر کان دھرا جاتا ہے اور نہ والدین کی آہیں اثر کرتی ہیں"۔

اسی اخبار میں یہ روح فرسا خبر بھی درج ہے:

۱۹۴۹ء میں جب ماؤ کے سُرخ لشکر مشرقی ترکستان میں داخل ہوئے تو اس وقت وہاں چینیوں کی کل تعداد ۳ لاکھ تھی اور اب یہ تعداد ۳۰ لاکھ ہو گئی ہے اور ابھی چینیوں کو بسانے اور ترکستانیوں کو نکالنے کا سلسلہ جاری ہے۔ ثقافتی انقلاب کے بعد اس تعداد میں مزید اضافہ ہوا ہے[1]۔

ایک سچا مسلمان دین کے بارے میں تو حسّاس ہوتا ہی ہے مگر وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سب سے زیادہ نازک جذبات رکھتا ہے۔ اس عالمِ محسوسات میں ایک مسلمان کو جس قدر محبت حضورؐ کی ذات اقدس سے ہوتی ہے وہ کسی اور سے نہیں ہو سکتی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی محبت اور عقیدت کے سب سے بڑے مرکز ہیں۔ باقی سب عقیدتیں اسی کی تابع ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ قلبی لگاؤ ایمان کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم صرف ایک مصلح ہی نہیں بلکہ منشاءِ خداوندی کے آخری شارح اور ترجمان ہیں۔ ان کی محبت سے انسان کے دل و دماغ میں ایمان کی شمع روشن ہوتی ہے۔ اور ان کی اطاعت و فرمانبرداری سے انسان دنیا و آخرت میں خائز المرام ہوتا ہے۔ مسلمانوں کے ہاں تصوّف کے کئی سلسلے رائج ہیں اور فقہ کے کئی نظام موجود ہیں، مگر ان کا مطالعہ کرنے سے یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے کہ قلب کی گہرائیوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت راسخ ہو جائے اور انسانی افعال و اعمال حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کا عکس پیش کریں۔

دُنیا کی غیر مسلم قومیں حضورؐ سرورِ دو عالم کے بارے میں مسلمانوں کے ان احساسات سے پوری طرح واقف ہیں۔ چنانچہ انہوں نے جب بھی اسلام اور مسلمانوں پر حملہ کیا تو سب سے پہلے ہدف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس کو بنایا اور پھر اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ کفر ان کے اندر کہاں تک سرایت کر چکا

---

[1] روزنامہ الندوہ ۷ ارجون ۱۹۶۸ء کا یہ اقتباس جناب خلیل حامدی صاحب کی کتاب "سُرخ اندھیروں میں" صفحہ ۲۲ پر درج ہے۔

ہے یہ دیکھا جا رہا کہ حضورؐ کے بارے میں ان کے احساسات کہاں تک سرد پڑ چکے ہیں۔ انہیں اس بات کا اچھی طرح علم ہے کہ جو دل حضور سرورِ کائنات کی محبت سے خالی ہو جاتے وہ نورِ ایمان سے یکسر محروم ہو جاتا ہے اور اس میں پھر سوائے کفر کی تاریکیوں کے اور کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ چنانچہ مسلمانوں کے اندر کفر پھیلانے کے لیے ان ظالموں نے حضورؐ کے بارے میں یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی کہ وہ نعوذ باللہ سرمایہ داروں کے ایجنٹ تھے۔ پیکنگ کے روزنامہ "کوانگ منگ جیہ پاؤ" HPAO KWANGMING کی ۱۰ جنوری ۱۹۷۱ء کی اشاعت میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں نبی آخر الزماںؐ پر نہایت رکیک حملے کیے گئے اور ان میں سے ایک خالص اشتراکی نوعیت کا حملہ یہ تھا:

"تم محمدؐ کے بارے میں یہ تو جانتے ہو کہ اس نے ایک ہاتھ میں تلوار اٹھا رکھی تھی اور دوسرے ہاتھ میں کتابِ تعلیم۔ مگر تم یہ نہیں جانتے کہ محمدؐ کے ایک ہاتھ میں بندوق تھی اور دوسرے میں تمہارا مال تھا۔"

نعوذ باللہ، مضمون نگار یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ حضور سرورِ کائنات سرمایہ داری کے علمبردار تھے اور وہ دوسرے کی محنت سے ناجائز انتفاع کیا کرتے تھے۔ ان کے فکر و عمل کا محرک غریب طبقوں کی کمائی کو ہتھیا لینا تھا۔[1]

---

[1] اِس آسمان کے نیچے اشتراکیوں سے زیادہ بے اصول اور متضاد باتیں کرنے والے لوگ کم ہی ملیں گے جب مسلمانوں کو فریب دینا ہو تو پھر اسلام کا تاریخی کردار یہ پیش کیا جاتا ہے کہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تحریک درحقیقت اُس دَور کے سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف ایک ردِّ عمل تھا جس نے غریبوں کے حقوق کی محافظت اور پاسبانی کی اور انہیں اس ظالمانہ نظام کی گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔ اس بنا پر اب جو تحریک سرمایہ داری کے خلاف کام کر رہی ہے مسلمانوں کو اس میں شامل ہونا چاہیے۔ لیکن جب اسلام اور مسلمانوں کو برباد کرنا مقصود ہو تو پھر اسی مذہب کو افیون، سرمایہ داروں کا ہتھیار اور ظالموں کے محافظ کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا تاریخی کردار بجز اس کے اور کوئی نہیں رہتا کہ اس کی شہ پاکر جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے کمزور طبقوں کی لوٹ کھسوٹ کی۔

چین کے آہنی پردے سے جو خبریں چھن چھن کر باہر آتی ہیں ان سے مساجد اور مکاتب کی حالتِ زار کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ آج سے ایک ہزار برس پیشتر چین میں پانچ ہزار مساجد تھیں۔ ان مساجد کی طرف قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ہزاروں کی تعداد میں مسلمان رجوع کرتے تھے لیکن اب ان میں سے بیشتر مساجد یا تو بند کر دی گئی ہیں یا انہیں کارخانوں اور دفاتر میں تبدیل کر دیا گیا ہے۔ چند مساجد باقی رہنے دی گئی ہیں تاکہ غیر ملکی سیاحوں کو دھوکا دیا جا سکے۔ ان مساجد میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے بجائے ماؤ کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مشہور اخبار دوتا ماشرکات (DULTA MASHSHARAKAT) میں، جو جکارتہ سے آسا یا ملنج کی ادارت میں شائع ہوتا ہے، اس کا تذکرہ یوں کیا گیا ہے:

"مذہبی تعلیم صرف چند مخصوص مسجدوں کے اندر دی جاتی ہے۔ مسلمان بچوں کے اندر روزانہ مادی نظریات کا بیج بویا جاتا ہے۔ ہم نے مسجد مانی سیر کو دیکھا۔ مردوں کے کئی گروہ کرزوں میں بیٹھے پڑھائی میں منہمک تھے۔ پہلی نظر میں ہم نے یہ خیال کیا یہ لوگ دین کی تعلیم میں مشغول ہیں۔ مگر بعد میں یہ راز افشا ہوا کہ انہیں اشتراکی نظریات، اشتراکی معاشیات اور ماؤ کی تعلیمات سے بہرہ مند کیا جا رہا ہے۔"

روس اور چین کے علاوہ دوسرے ممالک میں بھی جہاں اشتراکیت کو سرایت کرنے کا موقع ملا ہے وہاں اسلام کے ساتھ یہی افسوسناک سلوک کیا گیا ہے۔ اس وقت بدقسمتی سے دنیائے عرب اس کی لپیٹ میں آچکی ہے۔ مصر، عراق، شام سب اسی کے زخم خوردہ ہیں۔ یہ ممالک کسی وقت اسلامی اتحاد کا قابلِ رشک نمونہ پیش کرتے تھے مگر اب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں۔ کبھی ان ممالک کے باشندوں کو لسانی بنیادوں پر جمع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور کبھی خاکِ وطن سے ان کی قومیت کا خمیر اٹھایا جاتا ہے۔ اور کبھی نسلی تعلق اُبھار کر معاشرے کے مختلف طبقوں کو ایک دوسرے سے قریب کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے

مگر ان کوششوں میں سے کوئی ایک کوشش بھی کامیاب نہیں ہوئی ۔

اہلِ مغرب نے قومیت کا جو تصور دیا ہے وہ جارحانہ ہے۔ اور وہ محبت اور اخوت کے جذبات کے بجائے نفرت کے جذبات سے اپنی قوت فراہم کرتا ہے۔ مثلاً ایک زبان بولنے والوں کو قومیت کے رشتے میں منسلک کرنے کے لیے زبان کے اشتراک کا احساس بھی اگرچہ ضروری ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ ضروری چیز یہ ہے کہ جو لوگ اس زبان کے علاوہ دوسری زبانیں بولتے ہیں، اُن سے شدید نفرت کی جائے اور انھیں دنیا سے نیست و نابود کرنے کے دل میں عزائم پائے جائیں۔

اب جبکہ ان عرب ممالک نے اسلام کے رشتے کو چھوڑ کر قومیت کی تشکیل کے لیے دوسرے روابط تلاش کیے ہیں، جنہوں نے ان کے مزاج میں جارحیت اور نفرت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے، تو ان حالات میں یہ بات قطعاً بعید از قیاس نہیں کہ عربوں کا شیرازہ منتشر ہو جائے۔ چنانچہ یہ اندوہناک صورتِ حال ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ وادیِ نیل کے اتحاد کا خواب شرمندۂ تعبیر ہونے کے بجائے خوابِ پریشاں بن گیا ہے۔ عربوں کی وہ قوتیں جنہیں تعمیری کاموں میں کھپا کر ملّت کو ترقی کی راہ پر لگانا تھا وہ ایک دوسرے کو مٹانے میں صرف ہو رہی ہیں۔ انتشار اور باہمی عداوت کے اس ماحول میں اسلام دشمن طاقتوں کو ان عرب ممالک میں تسلط قائم کرنے کے بہت اچھے مواقع ہاتھ لگے ہیں۔

ان طاقتوں کی شروع ہی سے یہ کوشش رہی ہے کہ یہاں پائیدار اور مستقل غلبے کے لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اسلامی اقدار کا خاتمہ کیا جائے اور جب لوگوں کے قلب و دماغ اور معاشرے میں خلا پیدا ہو جائے تو پھر اس میں شیطان کو بسا دیا جائے۔ متحدہ عرب میں اشتراکیت کے سب سے بڑے علمبردار کرنل ناصر ہیں۔ انھوں نے ۴ نومبر ۱۹۶۱ء میں مصر کا "میثاقِ ملی" پیش کرتے ہوئے جو ملکی قانون کی اساس کی حیثیت رکھتا ہے۔ مندرجہ ذیل عزائم کا اظہار کیا ہے۔

"مصری انقلاب کے پیشِ نظر مصری سوسائٹی کو قومی، مادی، اشتراکی سوسائٹی بنانا ہے . . . . مصری سوسائٹی اپنے لیے جدید سوشل روابط تلاش کرے گی جو جدید اخلاقی

اقدار پر مبنی ہونگے اور جدید وطنی ثقافت سے ان کا اظہار ہوتا ہو گا . . . . میثاق ملی میں فراعنہ کے دورِ مصر کو انسانی تمدن کی اوّلین بنیاد قرار دیا گیا ہے "۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ "عرب سوشلزم" اشتراکیت کی کوئی نئی اور انوکھی قسم نہیں جو عربوں نے اپنے مخصوص حالات اور اپنی قومی اور دینی روایات کو مدنظر رکھ کر تشکیل کی ہو۔ یہ وہی ملحدانہ سوشلزم ہے جس کے تجربات روس اور چین میں کیے جا چکے ہیں ۔ جمال عبدالناصر نے اپنے "میثاق" میں اس کا صاف طور پر اعتراف کیا ہے :

"ترقی کا صحیح لائحۂ عمل اختیار کرنے کے لیے موزوں اسلوب سائنٹیفک سوشلزم ہے۔ کسی اور لائحۂ عمل سے یقینی طور پر مطلوبہ ترقی حاصل نہیں ہو سکتی "۔

اور یہ سائنٹیفک سوشلزم مارکسزم ہی ہے جس کے مطابق ہر دور کے عقائد و تصورات اخلاقی معیارات اور تہذیب و ثقافت اس عہد کے معاشی حالات خصوصاً پیدائشِ دولت کے طریقوں کے رہینِ منت ہوتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں دنیا کا کوئی عقیدہ ، کوئی معیار پائیدار قدر و قیمت کا حامل نہیں ہو سکتا ، بلکہ پیدائشِ دولت کے طریقوں کے ساتھ بدلتا رہتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی ادیب بڑے زوردار انداز میں یہ کہتے ہیں کہ " ہر دور کا اپنا قرآن ہے "۔

مصر کے ایک معروف سوشلسٹ ڈاکٹر جمال سعید نے اس حقیقت کو بڑے واشگاف الفاظ میں بیان کیا ہے :

"عرب سوشلزم کا یہ امتیاز نہیں کہ وہ ایک اقتصادی تحریک ہے ، بلکہ اس کا یہ امتیاز ہے کہ وہ ایک نظام ، ایک انسانی مذہب اور ایک اسلوبِ حیات ہے ۔ اس کا مقصد ایک نئے سماج کی تشکیل ہے ۔ یہ سوشلزم محض وسائلِ پیداوار کو فرد کی ملکیت سے نکال کر ریاست اور معاشرے کی ملکیت میں دینے کا نام نہیں ہے ۔ یہ مجرد قومی اقتصاد پر قبضہ کر لینے اور اسے معاشرے کی بہبود کے لیے مخصوص کر دینے کا نام نہیں ہے ۔ یہ محض اجتماعی اور اقتصادی اصلاح تک محدود نہیں بلکہ یہ فرد اور معاشرے کے لیے ہمہ پہلو نظری اور

عملی حل پیش کرتا ہے۔ سوشلزم ایک نئے سماج کی تعمیر کی جدوجہد کا نام ہے۔"

اب ذرا اس نئے سماج کے خدوخال بھی ملاحظہ فرمائیں۔

"عرب تہذیب کی تعمیر جدید اور عرب سماج کی تشکیلِ نو کا واحد راستہ یہ ہے کہ ایک جدت پسند انقلاب پرست اور اشتراکی انسان کو جنم دیا جائے جس کا پختہ ایمان ہو کہ خدا، دین، سرمایہ داری جاگیرداری، سامراج اور وہ تمام قدریں جو آج تک سماج پر مسلط ہیں محض حنوط شدہ لاشیں ہیں اور فقط تاریخ کے میوزیم کی زینت ہیں۔

جب ہم یہ شرط عائد کرتے ہیں کہ جدید انسان کو پچھلی تمام قدریں ردی کی ٹوکری میں اٹھاکر پھینک دینی چاہیں تو اس کے ساتھ ہمارا یہ بھی فرض ہے کہ ہم مخصوص نوعیت کی نئی قدریں وضع کریں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بنیادی طور پر ایک ہی قدر درکار ہے، اور وہ ہے جدید خود مختار انسان پر ایمانِ مطلق جو صرف اپنی ذات اور اپنے کام اور انسانیت کی خدمت پر بھروسا کرتا ہو۔ اور اسے یقین ہو کہ موت اسی کا حتمی خاتمہ ہے اور موت کے بعد کچھ نہیں ہے۔ جنت اور دوزخ سب افسانے ہیں انسان موت کے بعد ایک ذرے میں تبدیل ہو جاتا ہے اور گردشِ زمین کے ساتھ گردش کرتا رہتا ہے۔ ہمیں ایسے انسان کی ضرورت نہیں ہے جو نمازیں پڑھتا ہو اور ذلیل و عاجز بن کر رکوع میں جھکتا ہو، اپنے لیے رحم اور مغفرت کی طلب میں سرگرداں ہو۔ ہم جس انسان کے ضرورت مند ہیں وہ سوشلسٹ اور انقلاب پسند انسان ہے جس کا ایمان ہو کہ انسان ہی حقیقتِ مطلقہ ہے۔"

یہ ہے وہ نیا سماج جو سوشلزم کے سائے میں دنیائے عرب میں تشکیل پا رہا ہے۔ اشتراکیت کے ان عربی علمبرداروں کے نزدیک نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مقصد بھی صرف عرب قومیت کی تجدید و تکمیل تھا۔ انہوں نے زندگی کے معاملات میں جو فیصلے کیے یا انسان کو جن نئی اقدار سے آشنا کیا ان کے پیچھے صرف عرب قومیت کا جذبہ کارفرما تھا اور حضور سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے جس نئے صاحبِ ایمان

لہ یہ اقتباسات خلیل حاوی کی کتاب عالمِ اسلام اور اس کے افکار و مسائل سے لیے گئے ہیں

انسان کو جنم دیا اس کے امتیازی اوصاف یہ نہ تھے کہ اس نے اپنے خالق و مالک کو پہچان کر اس کی اطاعت اور بندگی اختیار کی۔ آخرت کی جوابدہی کے احساس کے پیش نظر اپنے نفس کو خود احکامِ الٰہی کا پابند بنایا۔ اپنے قلب و دماغ کو باطل خیالات اور اوہام سے پاک کیا اور زندگی کے سارے گوشوں میں پاکیزگی اور خدا ترسی پیدا کی، بلکہ اس نئے انسان کی اصل خوبی یہ تھی کہ اس نے اپنے وطن کے مسائل پر ایمان رکھنے کی تعلیم حاصل کی جس کو کمیونسٹ پارٹی کا لیڈر اپنے پُرپیچ طریق سے بیان کر رہا ہے اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ حضورؐ نہ تو خدا کی طرف سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور نہ انہوں نے انسان کو رُوحانی اقدار سے لذّت آشنا کیا ہے، بلکہ وہ اپنے عہد کی عرب قوم کے معاشی مسائل میں الجھے رہے اور انہوں نے ان معاشی تقاضوں کو کسی حد تک پورا کرنے کی کوشش کی۔ البتہ اپنے اس اصل مقصد کو ہمیشہ چھپا کر رکھا اور عوام کو اخلاق اور روحانیت کا درس دیتے رہے۔

یہ ہے نام نہاد مسلمان اشتراکیوں کے نزدیک حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا تاریخی کردار اور ان کی تعلیمات کی اصل نوعیت۔

ایک انسان جب روس کے اندر، چین کے اندر اور مسلمان ممالک کے اندر اشتراکیت کا اسلام کے بارے میں یہ معاندانہ رویہ دیکھتا ہے تو اس کے ذہن میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ان ممالک کے معاشی اور معاشرتی حالات میں نمایاں فرق کے باوجود روسی کمیونسٹ، چینی کمیونسٹ اور عرب کمیونسٹ کا دین کے بارے میں اندازِ فکر بالکل ایک جیسا ہے اور سب اس بات کے دل و جان سے قائل نظر آتے ہیں کہ جب تک اسلام کو پوری طرح ملیا میٹ نہیں کر دیا جاتا اس وقت تک اشتراکیت کا قصر تعمیر نہیں ہو سکتا۔ اشتراکیت کی مذہب دشمنی کسی وقتی ہیجان کا نتیجہ نہ تھی بلکہ یہ سب کچھ اس کے ملحدانہ مزاج کا فطری تقاضا ہے۔ جس طرح نور اور تاریکی یکجا نہیں ہو سکتے، جس طرح حق اور باطل ایک ساتھ پنپ نہیں سکتے، بالکل اسی طرح اشتراکیت اور اسلام ایک ساتھ زندہ نہیں رہ سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں نظاموں کے اساسی تصورات، ان کے مزاج، ان کے طریق ہائے انقلاب، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں میں کوئی چیز

(باقی ص ۶۴ پر)

تفہیم القرآن

الطلاق

(۳)

اور اگر وہ حاملہ ہوں تو ان پر اُس وقت تک خرچ کرتے رہو جب تک ان کا وضع حمل نہ ہو جائے[۱۱]

---

[۱۱] یہ امر متفق علیہ ہے کہ مطلقہ، خواہ رجعیہ ہو یا مبتوتہ، اگر حاملہ ہو تو وضع حمل تک اس کی سکونت اور اس کے نفقہ کا ذمہ دار شوہر ہے۔ البتہ اختلاف اُس صورت میں ہے جبکہ حاملہ کا شوہر مر گیا ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ طلاق دینے کے بعد مرا ہو، یا اس نے کوئی طلاق نہ دی ہو اور عورت زمانۂ حمل میں بیوہ ہو گئی ہو۔ اِس معاملہ میں فقہاء کے مسالک یہ ہیں:

(۱) حضرت علیؓ اور حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا قول ہے کہ شوہر کے مجموعی ترکہ میں اُس کا نفقہ واجب ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، قاضی شُریح، ابوالعالیہ، شَعبی اور ابراہیم نَخعی سے بھی یہی قول منقول ہے، اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بھی ایک قول اِسی کی تائید میں ہے (آلوسی، جَصّاص)۔

(۲) ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا دوسرا قول یہ نقل کیا ہے کہ اس پر اُس کے پیٹ کے بچہ کے حصّے میں سے خرچ کیا جائے اگر میّت نے کوئی میراث چھوڑی ہو۔ اور اگر میراث نہ چھوڑی ہو تو میّت کے وارثوں کو اُس پر خرچ کرنا چاہیے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ (البقرہ، آیت ۲۳۳)۔

(۳) حضرت جابرؓ بن عبداللہ، حضرت عبداللہ بن الزبیرؓ، حضرت حسن بصری، حضرت سعید بن المُسَیّب اور حضرت عطاء بن ابی رَباح کہتے ہیں کہ متوفی شوہر کے مال میں اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی ایک تیسرا قول یہی منقول ہوا ہے (جصّاص)۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر کے ترکہ میں سے اس کو جو میراث کا حصّہ

پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچے کو) دُودھ پلائیں تو ان کی اُجرت انہیں دو، اور بھلے طریقے سے (اُجرت کا معاملہ) باہمی گفت و شنید سے طے کر لو۔ [۱۰] لیکن اگر تم نے (اُجرت طے کرنے میں) ایک دوسرے کو تنگ کیا

ملا ہو اس سے وہ اپنا خرچ پُورا کر سکتی ہے، لیکن شوہر کے مجموعی ترکے پر اس کا نفقہ عائد نہیں ہوتا جس کا بار تمام وارثوں پر پڑے۔

(۴) ابن ابی لیلیٰ کہتے ہیں کہ اس کا نفقہ متوفی شوہر کے مال میں اُسی طرح واجب ہے جس طرح اُس کے مال میں کسی کا قرض واجب ہوتا ہے (جصاص)۔ یعنی مجموعی ترکہ میں سے جس طرح قرض ادا کیا جاتا ہے اسی طرح اس کا نفقہ بھی ادا کیا جائے۔

(۵) امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ، امام محمدؒ اور امام زُفرؒ کہتے ہیں کہ میت کے مال میں اس کے لیے نہ سکونت کا حق ہے نہ نفقہ کا۔ کیونکہ موت کے بعد میت کی کوئی ملکیت ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد تو وہ وارثوں کا مال ہے۔ اُن کے مال میں حاملہ بیوہ کا نفقہ کیسے واجب ہو سکتا ہے (ہدایہ، جصاص)۔ یہی مسلک امام احمدؒ بن حنبل کا ہے (الانصاف)۔

(۶) امام شافعیؒ کہتے ہیں کہ اس کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے، البتہ اسے سکونت کا حق ہے (مُغنی المحتاج)۔ ان کا استدلال حضرت ابوسعید خدریؓ کی بہن فُریعہ بنتِ مالک کے اِس واقعہ سے ہے کہ ان کے شوہر جب قتل کر دیے گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو حکم دیا کہ شوہر کے گھر ہی میں عدت گزاریں (ابوداؤد، نسائی، ترمذی)۔ مزید برآں ان کا استدلال دارقُطنی کی اِس روایت سے ہے کہ حضورؐ نے فرمایا لیس للحامل المتوفی عنها زوجها نفقة "وہ بیوہ حاملہ کے لیے کوئی نفقہ نہیں ہے"۔ یہی مسلک امام مالکؒ کا بھی ہے (حاشیۃ الدسوقی)۔

[۱۰] اِس ارشاد سے کئی اہم باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ عورت اپنے دُودھ کی مالک ہے، ورنہ ظاہر ہے کہ وہ اس کی اُجرت لینے کی مجاز نہیں ہو سکتی تھی۔ دوسرے یہ کہ جب وہ وضعِ حمل ہوتے ہی اپنے سابق شوہر کے نکاح سے باہر ہو گئی تو بچے کو دُودھ پلانے پر وہ قانوناً مجبور نہیں ہے بلکہ باپ اگر اُس سے دُودھ پلوانا چاہے اور وہ بھی راضی ہو تو وہ اُسے دودھ پلائے گی اور اس پر اُجرت لینے کی حق دار ہو گی۔ تیسرے یہ کہ باپ بھی قانوناً مجبور نہیں ہے کہ بچے کی ماں ہی سے اُس کو دودھ پلوائے۔ چوتھے یہ کہ بچے کا نفقہ باپ پر عائد ہوتا ہے۔ پانچویں یہ کہ بچے کو دُودھ پلانے کی اوّلین حق دار ماں ہے اور دوسری عورت سے رضاعت کا کام اُسی صورت میں لیا جا سکتا ہے جبکہ ماں خود اس پر راضی نہ ہو، یا اس کی ایسی اجرت مانگے جس کا ادا کرنا باپ کی مقدرت میں نہ ہو۔ اِسی سے چھٹا قاعدہ

تو بچے کو کوئی اور عورت دُودھ پلائے گی۔[۹ف] خوشحال آدمی اپنی خوشحالی کے مطابق نفقہ دے، اور جس کو رزق
کم دیا گیا ہو وہ اُسی مال میں سے خرچ کرے جو اللہ نے اسے دیا ہے۔ اللہ نے جس کو جتنا کچھ دیا ہے اُس
سے زیادہ کا وہ اُسے مکلّف نہیں کرتا۔ بعید نہیں کہ اللہ تنگ دستی کے بعد فراخ دستی بھی عطا فرما دے۔ ع ۱

یہ نکلتا ہے کہ اگر دوسری عورت کو بھی وہی اُجرت دینی پڑے جو بچے کی ماں مانگتی ہو تو ماں کا حق اوّلی ہے۔

فقہاء کی آراء اس مسئلے میں یہ ہیں:

ضحاک کہتے ہیں کہ "بچے کی ماں اسے دُودھ پلانے کی زیادہ حق دار ہے۔ مگر اسے اختیار ہے کہ چاہے دُودھ پلائے یا نہ پلائے۔ البتہ اگر بچہ دوسری عورت کی چھاتی قبول نہ کرے تو ماں کو اسے دُودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا"۔ اسی سے ملتی جلتی رائے قتادہ اور ابراہیم نخعی اور سُفیان ثوری کی ہے۔ ابراہیم نخعی یہ بھی کہتے ہیں کہ "اگر دوسری عورت رضاعت کے لیے نہ مل رہی ہو تب بھی ماں کو اسے دُودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا" (ابن جریر)۔

ہدایہ میں ہے: "اگر ماں باپ کی علٰحدگی کے وقت چھوٹا بچہ دُودھ پیتا ہو تو ماں پر یہ فرض نہیں ہے کہ وہی اسے دُودھ پلائے۔ البتہ اگر دوسری عورت نہ ملتی ہو تو وہ رضاعت پر مجبور کی جائے گی۔ اور اگر باپ یہ کہے کہ میں بچے کی ماں کو اُجرت دے کر اس سے دودھ پلوانے کے بجائے دوسری عورت سے اُجرت پر یہ کام لُونگا، اور ماں دوسری عورت ہی کے برابر اُجرت مانگ رہی ہو، یا بلا اُجرت ہی اس خدمت کے لیے راضی ہو، تو اس صورت میں ماں کا حق مقدم رکھا جائے گا۔ اور اگر بچے کی ماں زیادہ اُجرت مانگ رہی ہو تو باپ کو اس پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔"

[۹ف] اس میں ماں اور باپ دونوں کے لیے عتاب کا ایک پہلو ہے۔ اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ پچھلی تلخیوں کی بنا پر، جن کے باعث بالآخر طلاق تک نوبت پہنچی تھی، دونوں بھلے طریقہ سے آپس میں بچے کی رضاعت کا معاملہ طے نہ کریں تو یہ اللہ کو پسند نہیں ہے۔ عورت کو تنبیہ کی گئی ہے کہ تو زیادہ اُجرت مانگ کر مرد کو تنگ کرنے کی کوشش کرے گی تو بچے کی پرورش کچھ تیرے ہی اوپر موقوف نہیں ہے، کوئی دوسری عورت اسے دودھ پلائے گی۔ اور مرد کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ اگر تو ماں کی مامتا سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اسے تنگ کرنا چاہے گا تو یہ بھلے آدمیوں کا سا کام نہ ہوگا۔ قریب قریب یہی مضمون سورۂ بقرہ، آیت ۲۳۳ میں زیادہ تفصیل کے ساتھ ارشاد ہوا ہے۔

کتنی[۲۰] ہی بستیاں ہیں جنہوں نے اپنے رب اور اس کے رسولوں کے حکم سے سرتابی کی تو ہم نے ان سے سخت محاسبہ کیا اور ان کو بُری طرح سزا دی۔ انہوں نے اپنے کیے کا مزا چکھ لیا اور ان کا انجام کار گھاٹا ہی گھاٹا ہے۔ اللہ نے (آخرت میں) ان کے لیے سخت عذاب مہیا کر رکھا ہے۔ پس اللہ سے ڈرو اے صاحبِ عقل لوگو جو ایمان لاتے ہو۔ اللہ نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کر دی ہے، ایک ایسا رسول[۲۱] جو تم کو اللہ کی صاف صاف ہدایت دینے والی آیات سناتا ہے تاکہ ایمان لانے والوں اور نیک عمل کرنے والوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لے آئے[۲۲]۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے اور نیک عمل کرے، اللہ اُسے

۲۰؎ اب مسلمانوں کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کے رسول اور اس کی کتاب کے ذریعہ سے جو احکام اُن کو دیئے گئے ہیں اُن کی اگر وہ نافرمانی کریں گے تو دنیا اور آخرت میں کس انجام سے دوچار ہونگے، اور اگر اطاعت کی راہ اختیار کریں گے تو کیا جزا پائیں گے۔

۲۱؎ مفسرین میں سے بعض نے نصیحت سے مراد قرآن لیا ہے، اور رسول سے مراد محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اور بعض کہتے ہیں کہ نصیحت سے مراد خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، یعنی آپ کی ذات ہمہ تن نصیحت تھی۔ ہمارے نزدیک یہی دوسری تفسیر زیادہ صحیح ہے، کیونکہ پہلی تفسیر کی رُو سے فقرہ یوں بنانا پڑے گا کہ "ہم نے تمہاری طرف ایک نصیحت نازل کی ہے اور ایک ایسا رسول بھیجا ہے"۔ قرآن کی عبارت میں اس تبدیلی کی آخر ضرورت کیا ہے جبکہ اس کے بغیر ہی عبارت نہ صرف پوری طرح بامعنی ہے بلکہ زیادہ پُر معنی بھی ہے۔

۲۲؎ یعنی جہالت کی تاریکیوں سے علم کی روشنی میں نکال لاتے۔ اِس ارشاد کی پُوری اہمیت اُس وقت سمجھ میں آتی ہے جب انسان طلاق، عدت اور نفقات کے متعلق دنیا کے دوسرے قدیم اور جدید عائلی قوانین کا مطالعہ کرتا ہے۔ اس تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ بار بار کی تبدیلیوں اور نت نئی قانون سازیوں کے باوجود آج تک کسی قوم کو ایسا معقول اور فطری اور معاشرے کے لیے مفید قانون میسر نہیں آسکا ہے جیسا کہ ۱۴ سو برس پہلے اِس کتاب اور اِس کے لانے والے رسولؐ نے ہم کو دیا تھا اور جس پر کسی نظرِ ثانی کی ضرورت نہ کبھی پیش آئی نہ پیش آسکتی ہے۔ یہاں اِس تقابلی بحث کا موقع نہیں ہے۔ اس کا محض ایک مختصر سا نمونہ ہم نے اپنی کتاب "حقوق الزوجین" کے آخری حصہ میں درج کیا ہے۔ لیکن جو اصحابِ علم چاہیں وہ دنیا کے مذہبی اور لادینی

ایسی جنّتوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہونگی - یہ لوگ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے ایسے شخص کے لیے بہترین رزق رکھا ہے۔

اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم سے بھی اُنہی کے مانند۔[۲۳] ان کے درمیان حکم نازل ہوتا رہتا ہے۔ (یہ بات تمہیں اس لیے بتائی جا رہی ہے) تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے، اور یہ کہ اللہ کا علم ہر چیز پر محیط ہے ؏ ۲

قوانین سے قرآن وسنّت کے اِس قانون کا مقابلہ کر کے خود دیکھ لیں۔

۲۳ے "اُنہی کے مانند" کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جتنے آسمان بنائے اُتنی ہی زمینیں بھی بنائیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جیسے متعدد آسمان اُس نے بنائے ہیں ویسی ہی متعدد زمینیں بھی بنائی ہیں۔ اور "زمین کی قسم سے" کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ زمین جس پر انسان رہتے ہیں، اپنی موجودات کے لیے فرش اور گہوارہ بنی ہوئی ہے اُسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات میں اور زمینیں بھی تیار کر رکھی ہیں جو اپنی اپنی آبادیوں کے لیے فرش اور گہوارہ ہیں۔ بلکہ بعض مقامات پر تو قرآن میں یہ اشارہ بھی کر دیا گیا ہے کہ جاندار مخلوقات صرف زمین ہی پر نہیں ہیں، عالمِ بالا میں بھی پائی جاتی ہیں (مثال کے طور پر ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الشوریٰ، آیت ۲۹، حاشیہ ۵۰)۔ بالفاظ دیگر آسمان میں یہ جو بے شمار تارے اور سیارے نظر آتے ہیں، یہ سب ڈھنڈار پڑے ہوئے نہیں ہیں بلکہ زمین کی طرح ان میں بھی بکثرت ایسے ہیں جن میں دنیائیں آباد ہیں۔

قدیم مفسرین میں سے صرف ابن عباسؓ ایک ایسے مفسّر ہیں جنہوں نے اُس دَور میں اِس حقیقت کو بیان کیا تھا جب آدمی اِس کا تصوّر تک کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ کائنات میں اس زمین کے سوا کہیں اور بھی ذی عقل مخلوق بستی ہے۔ آج اِس زمانے کے سائنس دانوں تک کو اِس کے امرِ واقعہ ہونے میں شک ہے، کجا کہ ۱۴ سو برس پہلے کے لوگ اِسے بآسانی باور کر سکتے۔ اسی لیے ابن عباس رضی اللہ عنہ عام لوگوں کے سامنے یہ بات کہتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں اس سے لوگوں کے ایمان متزلزل نہ ہو جائیں۔ چنانچہ مجاہد کہتے ہیں کہ اُن سے جب اس آیت کا مطلب پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا "اگر میں اس کی تفسیر تم لوگوں سے بیان کروں تو تم کافر ہو جاؤ گے اور تمہارا کفر یہ ہوگا کہ اسے جھٹلاؤ گے"۔ قریب قریب یہی بات سعید بن جُبیر سے بھی منقول ہے کہ ابن عباس نے فرمایا "کیا بھروسا کیا جا سکتا ہے کہ اگر میں تمہیں اس کا مطلب بتاؤں تو تم کافر نہ ہو جاؤ گے"۔ (ابن جریر۔ عبد بن حُمید)۔ تاہم ابن جریر، ابن ابی حاتم اور حاکم نے، اور

شُعَب الایمان اور کتاب الاسماء والصفات میں بیہقی نے ابوالضحٰی کے واسطے سے باختلافِ الفاظ ابن عباس کی یہ تفسیر نقل کی ہے کہ فی کلِّ ارضٍ نبیٌّ کنبیّکم و آدمُ کآدمَ و نوحٌ کنوحٍ و ابراھیمُ کابراھیمَ و عیسٰی کعیسٰی" ان میں سے ہر زمین میں نبی ہے تمہارے نبی جیسا اور آدم ہے تمہارے آدم جیسا اور نوح ہے تمہارے نوح جیسا، اور ابراہیم ہے تمہارے ابراہیم جیسا اور عیسیٰ ہے تمہارے عیسٰیؑ جیسا" اس روایت کو ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں بھی نقل کیا ہے۔ اور امام ذہبی نے کہا ہے کہ اس کی سند صحیح ہے البتہ میرے علم میں ابوالضحٰی کے سوا کسی نے اسے روایت نہیں کیا ہے۔ اس لیے یہ بالکل شاذ روایت ہے۔ بعض دوسرے علماء نے اسے کذب اور موضوع قرار دیا ہے اور ملا علی قاری نے اس کو موضوعاتِ کبیر (ص ۱۹) میں موضوع کہتے ہوئے لکھا ہے کہ اگر یہ ابنِ عباس ہی کی روایت ہے تب بھی اسرائیلیات میں سے ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسے رد کرنے کی اصل وجہ لوگوں کا اِسے بعید از عقل و فہم سمجھنا ہے، ورنہ بجائے خود اس میں کوئی بات بھی خلافِ عقل نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی اپنی تفسیر میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:" اس کو صحیح ماننے میں نہ عقلاً کوئی چیز مانع ہے نہ شرعاً۔ مراد یہ ہے کہ ہر زمین میں ایک مخلوق ہے جو ایک اصل کی طرف اُسی طرح راجع ہوتی ہے جس طرح بنی آدم ہماری زمین میں آدم علیہ السلام کی طرف راجع ہوتے ہیں۔ اور ہر زمین میں ایسے افراد پائے جاتے ہیں جو اپنے ہاں دوسروں کی بہ نسبت اُسی طرح ممتاز ہیں جس طرح ہمارے ہاں نوح اور ابراہیم علیہما السلام ممتاز ہیں" آگے چل کر علامہ موصوف کہتے ہیں:" ممکن ہے کہ زمینیں سات سے زیادہ ہوں اور اسی طرح آسمان بھی صرف سات ہی نہ ہوں۔ سات کے عدد پر، جو عدد تام ہے اکتفا کرنا اِس بات کو مستلزم نہیں کہ اس سے زائد کی نفی ہو" پھر بعض احادیث میں ایک ایک آسمان کی درمیانی مسافت جو پانچ پانچ سو برس بیان کی گئی ہے اس کے متعلق علامہ موصوف کہتے ہیں کہ ھو من باب التقریب للافھام، یعنی اس سے مراد ٹھیک ٹھیک مسافت کی پیمائش بیان کرنا نہیں ہے، بلکہ مقصود بات کو اس طرح بیان کرنا ہے کہ وہ لوگوں کی سمجھ سے قریب تر ہو۔

یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ حال میں امریکہ کے رانڈ کارپوریشن (RAND CORPORATION) نے فلکی مشاہدات سے اندازہ لگایا ہے کہ زمین جس کہکشاں (GALAXY) میں واقع ہے صرف اُسی کے اندر تقریباً ۶۰ کروڑ ایسے سیارے پائے جاتے ہیں جن کے طبعی حالات ہماری زمین سے بہت کچھ ملتے جلتے ہیں اور امکان ہے کہ ان کے اندر بھی جاندار مخلوق آباد ہو (اکانومسٹ لندن۔ مورخہ ۲۶ جولائی ۱۹۶۹ء)

تفہیم القرآن

التحریم

نام | پہلی ہی آیت کے الفاظ لِمَ تُحَرِّمُ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی اس کے مضامین کا عنوان نہیں ہے، بلکہ اس نام سے مُراد یہ ہے کہ یہ وہ سُورہ ہے جس میں تحریم کے واقعہ کا ذکر آیا ہے۔

زمانۂ نزول | اِس میں تحریم کے جس واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کے متعلق احادیث کی روایات میں دو خواتین کا ذکر آیا ہے جو اُس وقت حضوؐر کے حرم میں تھیں۔ ایک حضرت صفیہؓ۔ دوسری حضرت ماریہؓ قبطیہ۔ ان میں سے ایک، یعنی حضرت صفیہ فتح خیبر کے بعد حضوؐر کے نکاح میں آئیں، اور خیبر کی فتح بالاتفاق ۷ھ میں ہوئی ہے۔ دوسری خاتون حضرت ماریہ کو ۷ھ میں مصر کے فرمانروا مُقوقِس نے حضوؐر کی خدمت میں ارسال کیا تھا اور اُن کے بطن سے ذی الحجہ ۸ھ میں حضوؐر کے فرزند حضرت ابراہیمؓ پیدا ہوئے تھے۔ ان تاریخی واقعات سے یہ بات قریب قریب متعیّن ہو جاتی ہے کہ اس سُورہ کا نزول ۷ھ یا ۸ھ کے دوران میں کسی وقت ہوا ہے۔

موضوع اور مباحث | یہ ایک بڑی اہم سورۃ ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی ازواجِ مطہراتؓ کے متعلق بعض واقعات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے چند مہمّاتِ مسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک یہ کہ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کے حدود مقرر کرنے کے اختیارات قطعی طور پر اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں، اور عام انسان تو درکنار، خود اللہ کے نبیؐ کی طرف بھی اُن کا کوئی حصّہ منتقل نہیں کیا گیا ہے۔ نبی بحیثیتِ نبی اگر کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دے سکتا ہے تو صرف اس صورت میں جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا اشارہ ہو، قطع نظر اس سے کہ وہ اشارہ قرآن مجید

میں نازل ہوا ہو، یا وحی خفی کے طور پر کیا گیا ہو۔ لیکن بطورِ خود اللہ کی مباح کی ہوئی کسی چیز کو حرام کر لینے کا نبی بھی مجاز نہیں ہے کجا کہ کوئی اور شخص ہو سکے۔

دوسرے یہ کہ انسانی معاشرہ میں نبی کا مقام انتہائی نازک مقام ہے۔ ایک معمولی بات بھی، جو کسی دوسرے انسان کی زندگی میں پیش آتے تو چنداں اہمیت نہیں رکھتی، نبی کی زندگی میں اگر پیش آجاتے تو وہ قانون کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام کی زندگی پر ایسی کڑی نگرانی رکھی گئی ہے کہ ان کا کوئی ادنیٰ اقدام بھی منشاءِ الٰہی سے ہٹا ہوا نہ ہو۔ ایسا کوئی فعل بھی اگر نبی سے صادر ہوا ہے تو اس کی فوراً اصلاح کر دی گئی ہے تاکہ اسلامی قانون اور اس کے اصول اپنی بالکل صحیح صورت میں نہ صرف خدا کی کتاب، بلکہ نبی کے اُسوۂ حسنہ کی صورت میں بھی خدا کے بندوں تک پہنچ جائیں اور ان میں ذرہ برابر بھی کوئی چیز ایسی شامل نہ ہونے پائے جو منشاءِ الٰہی سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔

تیسری بات جو مذکورۂ بالا نکتہ سے خود بخود نکلتی ہے وہ یہ ہے کہ ایک ذرا سی بات پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹوک دیا گیا اور نہ صرف اس کی اصلاح کی گئی بلکہ اسے ریکارڈ پر بھی لے آیا گیا، تو یہ چیز قطعی طور پر ہمارے دل میں یہ اطمینان پیدا کر دیتی ہے کہ حضورؐ کی حیاتِ طیبہ میں جو اعمال و افعال اور جو احکام و ہدایات بھی ہمیں اب ملتے ہیں، اور جن پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی گرفت یا اصلاح ریکارڈ پر موجود نہیں ہے، وہ سراسر برحق ہیں، اللہ کی مرضی سے پوری مطابقت رکھتے ہیں، اور ہم پورے اعتماد کے ساتھ ان سے ہدایت و رہنمائی حاصل کر سکتے ہیں۔

چوتھی بات جو اس کلام میں ہمارے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جس رسولِ مقدس کی عزت و حرمت کو اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کے حق میں لازمۂ ایمان قرار دیتا ہے اُسی کے متعلق اِس سورہ میں بیان کیا گیا ہے کہ اُس نے اپنی بیویوں کو خوش کرنے کے لیے ایک مرتبہ اللہ کی حلال کی ہوئی ایک چیز اپنے اوپر حرام کر لی۔ اور جن ازواجِ مطہرات کو اللہ تعالیٰ خود تمام اہلِ ایمان کی ماں قرار دیتا ہے اور جن کے احترام کا اس نے خود مسلمانوں کو حکم دیا ہے انہی کو اس نے بعض

غلطیوں پر اِس سورہ میں شدت سے تنبیہ فرمائی ہے۔ پھر نبی پر یہ گرفت اور ازواج مطہرات کو یہ تنبیہ بھی خفیہ طور پر نہیں کی گئی بلکہ اُس کتاب میں درج کر دی گئی جسے تمام امت کو ہمیشہ ہمیشہ تلاوت کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ کتاب اللہ میں اِس ذکر کا منشا نہ یہ تھا، نہ یہ ہو سکتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول اور امہات المومنین کو اہلِ ایمان کی نگاہوں سے گرا دینا چاہتا تھا۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ قرآن پاک کی یہ سورۃ پڑھ کر کسی مسلمان کے دل سے ان کا احترام اٹھ نہیں گیا ہے۔ اب قرآن میں یہ ذکر لانے کی مصلحت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کو اپنے بزرگوں کے احترام کی صحیح حدوں سے آشنا کرنا چاہتا ہے۔ نبی، نبی ہے، خدا نہیں ہے کہ اس سے کوئی لغزش نہ ہو۔ نبی کا احترام اس بنا پر نہیں ہے کہ اس سے لغزش کا صدور ناممکن ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ وہ مرضی الٰہی کا مکمل نمائندہ ہے اور اس کی ادنیٰ سی لغزش کو بھی اللہ نے اصلاح کیے بغیر نہیں چھوڑا ہے جس سے ہمیں یہ اطمینان نصیب ہو جاتا ہے کہ نبی کا چھوڑا ہوا اُسوۂ حسنہ اللہ کی مرضی کی پوری نمائندگی کر رہا ہے۔ اِسی طرح صحابۂ کرام ہوں یا ازواجِ مطہرات، یہ سب انسان تھے، فرشتے یا فوق البشر نہ تھے۔ ان سے غلطیوں کا صدور ہو سکتا تھا۔ اُن کو جو مرتبہ بھی حاصل ہوا اِس وجہ سے ہوا کہ اللہ کی رہنمائی اور اللہ کے رسولؐ کی تربیت نے ان کو انسانیت کا بہترین نمونہ بنا دیا تھا۔ اُن کا جو کچھ بھی احترام ہے اِسی بنا پر ہے، نہ کہ اِس مفروضے پر کہ وہ کچھ ایسی ہستیاں تھیں جو غلطیوں سے بالکل مبرا تھیں۔ اِسی وجہ سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں صحابہ یا ازواجِ مطہرات سے بشریت کی بنا پر جب بھی کسی غلطی کا صدور ہوا اُس پر ٹوکا گیا۔ اُن کی بعض غلطیوں کی اصلاح حضورؐ نے کی جس کا ذکر احادیث میں بکثرت مقامات پر آیا ہے۔ اور بعض غلطیوں کا ذکر قرآن مجید میں کر کے اللہ تعالیٰ نے خود ان کی اصلاح کی تاکہ مسلمان کبھی بزرگوں کے احترام کا کوئی ایسا مبالغہ آمیز تصور نہ قائم کر لیں جو انہیں انسانیت کے مقام سے اٹھا کر دیویوں اور دیوتاؤں کے مقام پر پہنچا دے۔ آپ قرآن پاک کا مطالعہ آنکھیں کھول کر کریں تو اِس کی پے در پے مثالیں آپ کے سامنے آئیں گی۔ سورۂ آل عمران میں جنگِ اُحد کا ذکر کرتے ہوئے صحابۂ کرام کو مخاطب کر کے فرمایا:

"اللہ نے (تائید و نصرت) کا جو وعدہ تم سے کیا تھا وہ تو اُس نے پورا کر دیا جبکہ اُس کے اذن سے تم اُن کو قتل کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب تم نے کمزوری دکھائی اور اپنے کام میں باہم اختلاف کیا اور جونہی کہ وہ چیز اللہ نے تمہیں دکھائی جس کی محبت میں تم گرفتار تھے (یعنی مالِ غنیمت)، تم حکم کی نافرمانی کر بیٹھے، تم میں سے کوئی دنیا کا طالب تھا اور کوئی آخرت کا طلب گار، تب اللہ نے تمہیں اُن کے مقابلہ میں پسپا کر دیا تاکہ تمہاری آزمائش کرے۔ اور حق یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں معاف کر دیا، اللہ مومنوں پر بڑا فضل فرمانے والا ہے" (آیت ۱۵۲)

سورۂ نور میں حضرت عائشہؓ پر تہمت کا ذکر کرتے ہوئے صحابہؓ سے فرمایا گیا:

"ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم لوگوں نے اِسے سُنا تھا اُسی وقت مومن مرد اور عورتیں، سب اپنے آپ سے نیک گمان کرتے اور کہہ دیتے کہ یہ تو صریح بہتان ہے؟ .... اگر تم لوگوں پر دنیا اور آخرت میں اللہ کا فضل اور رحم و کرم نہ ہوتا تو جن باتوں میں تم پڑ گئے تھے ان کی پاداش میں بڑا عذاب تمہیں آلیتا۔ ذرا غور کرو، جب تمہاری ایک زبان سے دوسری زبان اِس قصّے کو لیتی چلی جارہی تھی اور تم اپنے منہ سے وہ کچھ کہے جارہے تھے جس کے متعلق تمہیں کوئی علم نہ تھا۔ تم اِسے ایک معمولی بات سمجھ رہے تھے حالانکہ اللہ کے نزدیک یہ بڑی بات تھی۔ کیوں نہ اِسے سُنتے ہی تم نے کہہ دیا کہ ہمیں ایسی بات زبان سے نکالنا زیب نہیں دیتا، سبحان اللہ، یہ تو ایک بہتانِ عظیم ہے؟ اللہ تم کو نصیحت کرتا ہے کہ آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اگر تم مومن ہو" (آیات ۱۲ تا ۱۷)۔

سُورۂ احزاب میں ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا:

"اے نبی اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ، میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں۔ اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور آخرت کی طلبگار ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکوکار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے" (آیات ۲۸-۲۹)۔

سُورۂ جُمعہ میں صحابہؓ کے متعلق فرمایا:

"جب انہوں نے کاروبارِ تجارت یا کھیل تماشا دیکھا تو اس کی طرف دوڑ گئے اور (اے نبی)

تم کو خطبے میں کھڑا چھوڑ دیا۔ اِن سے کہو کہ جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ کھیل تماشے اور تجارت سے بہتر ہے اور اللہ بہترین رزق دینے والا ہے" (آیت ۱۱)۔

سُورۂ مُمتَحِنَہ میں ایک بدری صحابی حضرت حاطِبؓ بن ابی بَلتَعَہ کے اِس فعل پر سخت گرفت کی گئی کہ انہوں نے فتح مکہ سے پہلے حضورؐ کے حملے کی خُفیہ اطلاع کفّارِ قریش کو بھیج دی تھی۔

یہ ساری مثالیں خود قرآن میں موجود ہیں، اُسی قرآن میں جس میں اللہ تعالیٰ نے صحابہ اور ازواجِ مطہرات کے فضل و شرف کو خود بیان فرمایا ہے اور اُنہیں رضی اللہ عنہم و رَضُوا عَنہ کا پروانۂ خوشنودی عطا فرمایا ہے۔ بزرگوں کے احترام کی یہی مبنی بر اعتدال تعلیم تھی جس نے مسلمانوں کو انسان پرستی کے اُس ھاوِیہ میں گرنے سے بچایا جس میں یہود و نصاریٰ گر گئے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ حدیث، تفسیر اور تاریخ کے موضوعات پر جن اکابرِ اہلِ سنّت نے کتابیں مرتب کی ہیں ان میں جہاں صحابۂ کرام اور ازواجِ مطہرات اور دوسرے بزرگوں کے فضائل و کمالات بیان کیے گئے ہیں، ان کی کمزوریوں اور لغزشوں اور غلطیوں کے واقعات بیان کرنے میں بھی تامّل نہیں کیا گیا ہے، حالانکہ آج کے مدعیانِ احترام کی بہ نسبت وہ ان بزرگوں کے زیادہ قدر شناس تھے اور اِن سے زیادہ حدودِ احترام کو جانتے تھے۔

پانچویں بات جو اس سُورہ میں کھول کر بیان کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کا دین بالکل بے لاگ ہے۔ اس میں ہر شخص کے لیے صرف وہی کچھ ہے جس کا وہ اپنے ایمان اور اعمال کے لحاظ سے مستحق ہو۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی کے ساتھ نسبت بھی اس کے لیے قطعاً نافع نہیں ہے اور کسی بُری سے بُری ہستی کے ساتھ نسبت بھی اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اس معاملہ میں خاص طور پر ازواجِ مطہرات کے سامنے تین قسم کی عورتوں کو بطورِ مثال پیش کیا گیا ہے۔ ایک مثال حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی بیویوں کی ہے، جو اگر ایمان لاتیں اور اپنے جلیل القدر شوہروں کا ساتھ دیتیں تو ان کا مقام امّتِ مُسلمہ میں وہی ہوتا جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرات کا ہے۔ لیکن چونکہ انہوں نے اِس کے برعکس رویّہ اختیار کیا، اس لیے انبیاءؑ کی بیویاں ہونا ان کے کچھ کام نہ آیا اور وہ جہنّم کی مستحق ہوئیں۔ دوسری مثال فرعون کی بیوی کی ہے جو اگرچہ ایک بدترین دشمنِ خدا کی بیوی تھیں، لیکن چونکہ وہ ایمان لے آئیں اور انہوں نے

قوم فرعون کے عمل سے اپنے عمل کا راستہ الگ کر لیا۔ اس لیے فرعون جیسے اکفر الکافرین کی بیوی ہونا بھی اُن کے لیے کسی نقصان کا موجب نہ ہوا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں جنت کا مستحق بنا دیا۔ تیسری مثال حضرت مریم علیہا السلام کی ہے جنہیں یہ مرتبۂ عظیم اس لیے ملا کہ اللہ نے جس شدید آزمائش میں انہیں ڈالنے کا فیصلہ فرمایا تھا اس کے لیے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ حضرت مریم کے سوا دنیا میں کسی شریف اور نیک لڑکی کو کبھی ایسی سخت آزمائش میں نہیں ڈالا گیا کہ کنوار پنے کی حالت میں اللہ کے حکم سے اس کو حاملہ کر دیا گیا ہو اور اُسے بتا دیا گیا ہو کہ اُس کا رب اُس سے کیا خدمت لینا چاہتا ہے۔ جب حضرت مریم نے اِس پر کوئی واویلا نہ کیا بلکہ ایک سچی مومنہ کی حیثیت سے وہ سب کچھ برداشت کرنا قبول کر لیا جو اللہ کی مرضی پوری کرنے کے لیے برداشت کرنا ناگزیر تھا، تب اللہ نے ان کو سیّدۃ النسآءِ فی الجنۃ (مُسند احمد) کے مرتبۂ عالی پر سرفراز فرمایا۔

اِن اُمور کے علاوہ ایک اور اہم حقیقت جو اِس سُورہ سے ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس صرف وہی علم نہیں آتا تھا جو قرآن میں درج ہوا ہے۔ بلکہ آپ کو وحی کے ذریعہ سے دوسری باتوں کا علم بھی دیا جاتا تھا جو قرآن میں درج نہیں کیا گیا ہے۔ اس کی صریح دلیل اس سُورۃ کی آیت ۳ ہے۔ اُس میں بتایا گیا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ازواجِ مطہرات میں سے ایک بیوی سے راز میں ایک بات کہی اور اُنہوں نے وہ کسی اور کو بتا دی۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا۔ پھر جب حضورؐ نے اِس غلطی پر اپنی ان بیوی کو تنبیہ فرمائی، اور انہوں نے پوچھا کہ آپ کو میری یہ غلطی کس نے بتائی تو حضورؐ نے جواب دیا کہ مجھے علیم و خبیر ہستی نے اس کی خبر دی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ پُورے قرآن میں کہاں وہ آیت ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہو کہ "اے نبی، تم نے اپنی بیوی سے راز میں جو بات کہی تھی وہ اُس نے کسی اور پر، یا فلاں شخص پر ظاہر کر دی ہے"؟ اگر ایسی کوئی آیت قرآن میں نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ نہیں ہے، تو یہ اِس بات کا صریح ثبوت ہے کہ قرآن کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا نزول ہوتا تھا۔ اس سے منکرینِ حدیث کا یہ دعویٰ بالکل باطل ہو جاتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کے سوا اور کوئی وحی نہیں آتی تھی۔

حضرت معاویہؓ اور خلافت و ملوکیت

ملک غلام علی صاحب

(۶)

حضرت حُجرؓ کی فردِ جرم اب ہم اُس فردِ جرم کی ایک ایک شق کو لیتے ہیں جسے عثمانی صاحب نے حضرت حُجرؓ کو باغی ثابت کرنے کے لیے بڑی جزرسی کے ساتھ مرتب کیا ہے۔ پہلا الزام اس سلسلے میں یہ ہے کہ حضرت حجرؓ امیر معاویہ کی حکومت کے خلاف تھے اور وہ حضرات حسنینؓ کو بھی بار بار بغاوت پر اُکساتے رہے، لیکن یہ دونوں بزرگ کسی قیمت پر بھی امیر معاویہ کے خلاف اٹھنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خلافت کا آلِ ابی طالب کے سوا کوئی مستحق نہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کسی خلیفہ کی حکومت کو خوشدلی سے تسلیم نہ کرنا اور کسی دوسرے کو اس کے خلاف اُکسانا، یا کسی کو کسی کے مقابلہ میں خلافت کا مستحق سمجھنا شرعاً جرمِ بغاوت کی تعریف میں نہیں آتا، بالخصوص جبکہ اس اُکساہٹ کی حوصلہ شکنی دوسرے کی جانب سے ہو جائے اور عملاً کوئی بغاوت برپا نہ ہو۔ حضرت سعد بن عبادہؓ نے آخر دم تک حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہ کی اور وہ انصار کو مستحقِ خلافت سمجھتے تھے۔ یہ مشہور تاریخی واقعہ ہے۔ بعض مورخین کا بیان ہے کہ وہ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کے پیچھے نماز پنجگانہ اور جمعہ نہیں پڑھتے تھے، نہ ان کی قیادت میں حج کرتے تھے۔ اگر انہیں ساتھی مل جاتے تو وہ ان سے جنگ آزما ہونے سے بھی تامل نہ کرتے۔ لیکن کسی نے انہیں باغی قرار دے کر نہ قید کیا، نہ قتل کیا۔ دوسرا مشہور تاریخی واقعہ حضرت امیر معاویہؓ کے والد ماجد حضرت ابوسفیان کا ہے جسے استیعاب اور دوسری کتابوں میں بیان کیا گیا ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کی بیعت ہوئی تو ابوسفیانؓ حضرت علیؓ کے پاس آکر کہنے لگے کہ "یہ کیا ہوا کہ قریش کے سب سے چھوٹے قبیلے نے خلافت پر قبضہ کر لیا؟ اے علی، اگر تم پسند کرو تو خدا کی قسم میں اس وادی کو پیادوں اور سواروں سے بھر سکتا ہوں۔" حضرت علیؓ نے

جواب میں فرمایا کہ "تم ہمیشہ اسلام اور اہلِ اسلام کے دشمن بنے رہے، مگر اس سے اسلام اور مسلمانوں کو کوئی ضرر نہ پہنچ سکا۔ ہماری رائے یہ ہے کہ ابوبکر منصبِ خلافت کے اہل ہیں۔" یہ واقعہ متعدد کتابوں میں نقل ہوتا چلا آ رہا ہے، حتیٰ کہ امام ابن تیمیہؒ نے بھی اسے منہاج السنۃ میں کئی بار نقل کیا ہے، بلکہ یہاں تک لکھ دیا ہے:

فقد اراد ابوسفیان وغیرہ ان تکون الامارۃ فی بنی عبد مناف علی عادۃ الجاہلیۃ فلم یجبہ الی ذالک علی ولا عثمان ولا غیرھما لعلمھم ودینھم[1] "ابوسفیان اور کچھ دوسروں نے چاہا تھا کہ جاہلیت کے طریقے کے مطابق امارت بنو عبد مناف میں ہو مگر حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ اور دوسرے صحابہ کرام نے اپنے علم و تدیّن کی بنا پر ان کی اس خواہش کی حوصلہ افزائی نہ کی۔" اب میں عثمانی صاحب سے پوچھتا ہوں کہ اگر حضرت حجرؓ، حضرت حسنؓ یا حسینؓ کو امیر معاویہؓ کے خلاف اُکسانے کی بنا پر جرمِ بغاوت کے مرتکب تھے، تو کیا حضرت ابوسفیانؓ اِس جُرم کے بدرجۂ اولیٰ مرتکب نہ تھے؟ پھر کیا وجہ ہے کہ خلفائے راشدین میں سے کسی نے بھی انہیں اِس جُرم میں مأخوذ نہ کیا؟

دوسرا جُرم حضرت حجرؓ کا عثمانی صاحب نے یہ بیان کیا ہے کہ وہ حضرت عثمانؓ اور حضرت معاویہؓ پر کھلم کھلا طعن کرتے تھے، حالانکہ حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر نے کبھی حضرت علیؓ کی شان میں ایسی کوئی بات نہیں کہی لیکن اُمرائے معاویہؓ کی بات بات پر اُن کے خلاف شورش کرنا حضرت حجرؓ اور اُن کے ساتھیوں کی عادت بن گئی تھی۔ سبّ و شتمِ علیؓ و اہلِ بیت کے مسئلے پر جو مفصّل بحث میں کر چکا ہوں، اس کے بعد نہیں معلوم کہ عثمانی صاحب اب بھی اس دعوے سے رجوع فرمائیں گے یا نہیں کہ حضرت معاویہؓ کے کسی گورنر نے حضرت علیؓ کی شان میں کبھی کوئی بُری بات نہیں کہی۔ میں نے ناقابلِ انکار حوالوں سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ طعن و تشنیع اور سبّ و شتم کا آغاز امیر معاویہؓ اور ان کے گورنروں کی جانب سے ہوا تھا اور حضرت حجرؓ یا کسی دوسرے صاحب نے اس کے خلاف احتجاج کی جو صورت بھی اختیار کی ہے وہ ایک جوابی ردِّ عمل تھا۔ اور اگر اس طعن و تعریض کا نام بغاوت ہے، تو خلیفۂ راشد کی موجودگی اور ان کے عہدِ خلافت میں جنہوں نے اس فعل کو انجام دیا، سب سے پہلے بغاوت کے مرتکب وہ ہوں گے اور ان کا جُرم جوابی احتجاج کرنے والوں کے بالمقابل سنگین تر ہوگا۔ میں کہتا

[1] ملاحظہ ہو منہاج السنۃ جلد اول ص۱۱۶، المطبعۃ الامیریہ، بولاق مصر ۱۳۲۱ھ، جلد ثانی ص۱۹۶ جلد رابع ص۱۳۳۔

ہوں کہ سب و شتم کا آغاز اور اس کے جواب میں سب و شتم جس نے بھی کیا ہے، بہت بُرا کیا ہے۔ آج بھی جو ایسا کرتا ہے، بہت بُرا کرتا ہے۔ لیکن یہ جُرم بغاوت کے مترادف نہیں، نہ اس کی سزا قتل ہے۔ بعض علمائے سلف اس بات کے قائل تو ہوئے ہیں کہ شاتمِ رسولؐ واجب القتل ہے لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے سوا کسی دوسرے کی بدگوئی کرنا یا اُسے گالی بھی دے دینا اسلام میں ہرگز موجبِ قتل نہیں[ل] حضرت حُجرؓ بن عدی کے خلاف بغاوت اور سزائے قتل کا مقدمہ تیار کرتے وقت مدیرؔ "البلاغ" کا یہ کہنا کہ فلاں گورنر کے سامنے انہوں نے لعن طعن کیا، ایک خواہ مخواہ کا خلطِ مبحث ہے۔ اگر ایک گورنر علانیہ ایک صحابی کو، اور وہ بھی معمولی صحابی نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محبوب ترین عزیز اور خلیفہ راشد کو، اُن کی وفات کے بعد گالیاں دے رہا ہو جسے حضرت ام سلمہؓ نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب و شتم قرار دیا ہے، اس پر کوئی مسلمان مشتعل ہو کر اس کا ترکی بہ ترکی جواب دے تو اسے بغاوت، اور وہ بھی مستوجب قتل بغاوت قرار دینے کی جرأت صرف عثمانی صاحب ہی کر سکتے ہیں۔

یہ چیز فی الواقع میرے لیے سخت موجبِ حیرت ہے کہ حضرت حجرؓ بن عدی کی قیامِ کوفہ کے دوران میں اَنتشار پسندانہ اور باغیانہ سرگرمیوں کی داستان تو "البلاغ" میں لمبی چوڑی بیان کر دی گئی ہے، لیکن امیر معاویہؓ کے گورنروں کے اُس طرزِ عمل کو بالکل ہی گول کر دیا گیا ہے جس کے ردِ عمل میں وہ ساری سرگرمیاں ظہور میں آئیں جن پر بغاوت کا ٹھپہ لگایا جا رہا ہے۔ مؤرخ ابن خلدون جنہوں نے مولانا محمد تقی صاحب کے بقول اس دریائے خون میں بڑی سلامت روی سے شناوری کی ہے، اپنی تاریخ (ج ۳، صلا) میں جہاں اُن واقعات کا آغاز کرتے ہیں جو حضرت حجرؓ کے قتل پر منتج ہوئے، وہاں وہ بھی یہ کہے بغیر نہیں رہ سکے ہیں کہ: کان المغیرة بن شعبة ایام امارته علی الکوفة کثیراً ما یتعرض لعلی فی مجالسه وخطبه "مغیرہؓ بن شعبہ کوفہ کی

[ل] موجبِ قتل تو درکنار موجبِ تعزیر بھی نہیں۔ حضرت علیؓ کی حدودِ سلطنت میں رہ کر خوارج انہیں گالیاں دیتے تھے مگر اس پر حضرت علیؓ اُن کے خلاف کوئی کارروائی نہ کرتے تھے۔ اس پر امام سرخسی مبسوط، ج ۱۰ ص ۱۲۵ میں فرماتے ہیں وفیه دلیل علی ان التعریض بالشتم لا یوجب التعزیر "اس میں اس بات کی دلیل موجود ہے کہ فرمانروا کو گالی دینا موجب تعزیر نہیں ہے۔"

امارت کے زمانہ میں اکثر اپنی مجالس اور خطبوں میں حضرت علیؓ پر طعن و تعریض کرتے تھے" اس کے بعد زیاد نے جو طوفان بدتمیزی وہاں بپا کیا اور جن مظالم کا ارتکاب کیا، وہ تو رسوائے روزگار ہیں۔ جگہ جگہ مدیر البلاغ خود تسلیم کر رہے ہیں کہ وہ حضرت حجرؓ کو بار بار قتل کی دھمکیاں دیتا تھا اور کہتا تھا کہ میں کوفہ کی زمین کو حجر سے پاک نہ کر دوں اور اسے آنے والوں کے لیے سامانِ عبرت نہ بنا دوں تو میں بھی کوئی چیز نہیں۔ اس کے باوجود مدیر موصوف کے تجاہلِ عارفانہ کا یہ عالم ہے کہ فرماتے ہیں کہ واقعے کی تمام تفصیلات دیکھنے کے بعد ہمیں تو زیاد کے بارے میں کہیں یہ نظر نہ آسکا کہ اس نے اصولِ شرع کے خلاف کوئی کام کیا ہو۔ زیاد کے سفاکانہ جرائم کا حال میں ابن خلدون وغیرہ کی زبانی پہلے نقل کر چکا ہوں۔ استیعاب میں حافظ ابن عبدالبرؒ نے بھی یہی لکھا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے جب زیاد کو عراق کا والی بنایا تو اس نے درشتی اور بدخلقی کا مظاہرہ کیا (اظھر من الغلظۃ وسوء السیرۃ۔ استیعاب، ج ۱، ص ۲۵۵)۔

حضرت حجرؓ کے خلاف بغاوت کے الزام کو آخری حد تک پہنچانے کے لیے انتشار پسندی اور سب و شتم کے علاوہ مزید الزام جو عثمانی صاحب نے لگایا ہے وہ یہ ہے کہ حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں نے گورنر کوفہ پر پتھر برسائے اور باقاعدہ لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس تیسرے الزام کو ثابت کرنے کے لیے جو کھینچ تان کی گئی ہے اور جس طرح پر کا کوا اور سوئی کا بھالا بنانے کی کوشش کی گئی ہے، اس کی داد نہ دینا بڑی بے انصافی ہوگی۔ مثال کے طور پر مورخین کے بیان کے مطابق زیاد کو بصرے میں اطلاع دی گئی کہ حضرت حجرؓ کے پاس شیعانِ علیؓ جمع ہوتے ہیں۔ وانھم حصبوا عمرو بن حریث، اور انہوں نے حضرت عمروؓ بن حریث کو (جو کوفے میں زیاد کے نائب تھے) کنکریاں ماری ہیں۔ اس کا ترجمہ البلاغ ص ۱۲ میں یہ کیا گیا ہے کہ "انہوں نے پتھر برسائے ہیں" آخر میں ص ۲۱ پر جہاں جرم بغاوت کے اجزائے ترکیبی کو دہرایا گیا ہے وہاں عثمانی صاحب لکھتے ہیں کہ "گورنر کوفہ حضرت عمروؓ بن حریث پر پتھر برسائے" عثمانی صاحب کو چاہیے تھا کہ ساتھ ہی یہ بھی اضافہ فرما دیتے کہ ان پتھروں کی بارش سے کچھ لوگ زخمی یا ہلاک بھی ضرور ہوتے ہونگے اور مورخین نے اگر اس کا ذکر نہیں کیا تو یہ عدم ذکر ہی تو ہے، ذکرِ عدم تو نہیں۔[1]

---

[1] اس سلسلہ مضامین میں خطبوں کے دوران میں کنکریاں پھینکنے کا ذکر بار بار آرہا ہے۔ اس سے قارئین کو یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ کچھ نمازی طے شدہ پروگرام کے مطابق شاید باہر سے کنکر لے کر مسجد میں داخل ہوتے ہوں گے۔ دراصل اس زمانے میں

اس کے بعد جو واقعات البلاغ میں نقل کیے گئے ہیں، وہ مختصراً یہ ہیں: "زیاد اس کے بعد خود کوفے میں آیا، ایک طویل خطبہ دیا، جب نماز فوت ہوجانے کا اندیشہ ہوا تو حجرؓ نے اس پر بھی کنکریاں دے ماریں۔ زیاد نے سارے حالات حضرت معاویہؓ کو لکھ بھیجے۔ انہوں نے حکم دیا کہ حجر کو گرفتار کر کے میرے پاس بھیج دو۔ زیاد نے پولیس افسر کے ذریعے سے انہیں بلوایا مگر انہوں نے انکار کیا۔ زیاد نے زیادہ آدمی دے کر بھیجا کہ انہیں لے آؤ، ورنہ ان سے لڑائی کرو۔ اس پر فریقین میں لاٹھیوں اور پتھروں سے لڑائی ہوئی[1] مگر حجر گرفتار نہ ہوسکے اور فرار ہو کر کِندہ کے محلے میں پہنچے۔ یہاں بھی جنگ ہوئی اور ایک شخص نے رزمیہ اشعار پڑھے کہ "اے حجر کی قوم، دفاع کرو اور حملہ کرو اور اپنے بھائی کی طرف سے لڑنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔" یہاں سے حجر پھر فرار ہو کر روپوش ہوگئے۔ آخر کار امان کی شرط منوا کر وہ خود ہی زیاد کے سامنے پیش ہو گئے۔"

اس کے بعد عثمانی صاحب نے لکھا ہے کہ حجر کے دوسرے ساتھی بدستور روپوش رہے۔ نہ معلوم کس مصلحت کی بنا پر یہ نہیں بتایا کہ بعد میں وہ بھی گرفتار ہو گئے، حالانکہ آخر میں جا کر ان چودہ آدمیوں کا امیر معاویہ کے پاس بحالتِ گرفتاری جانا مذکور ہے جن میں سے چھ کو چھوڑ دیا گیا اور آٹھ کو قتل کر دیا گیا۔

حضرات حسنین کو خروج پر اکسانے اور حضرت علیؓ پر سب وشتم کے جواب میں امیر معاویہؓ اور ان کے گورنروں پر سب وشتم کرنے کے بعد حضرت حجرؓ نے زیاد اور اس کی پولیس کے خلاف مزاحمت کی جو روش اختیار کی، یہ گویا عثمانی صاحب کی دانست میں وہ آخری اور اہم ترین کڑی ہے جو جرم بغاوت کو پایۂ تکمیل و اثبات

مسجد کے فرش کچے ہوتے تھے اور ان پر چھوٹے چھوٹے سنگریزے بچھا دیئے جاتے تھے۔ بعض لوگ انہی کو اٹھا کر بحالتِ طیش پھینک دیتے تھے، جسے عثمانی صاحب نے سنگباری بنا دیا ہے۔

[1] اس "لڑائی" کی تفصیل ابن اثیر نے الکامل میں یہ دی ہے کہ جب زیاد کی پولیس لاٹھیاں برسانے لگی تو ایک شخص نے ایک لاٹھی چھین لی، اس سے لڑ کر اس نے حجر اور ان کے ساتھیوں کی جان بچائی یہاں تک کہ وہ کِندہ کے دروازوں سے نکل بھاگے (واخذ عمروا من بعض الشرط فقاتل به وحمی حجراً واصحابه حتیٰ خرجوا من ابواب الکندة۔ الکامل، ج ۳ ص ۲۳۵)۔ مورخین نے اس پورے ہنگامے کی جو تفصیلات بیان کی ہیں، ان میں صرف ایک مرتبہ تلوار کے استعمال کا ذکر میری نظر سے گزرا ہے جس کی ضرب سے ایک شخص منہ کے بل گر پڑا۔

تک پہنچا دیتی ہے۔ میں اسلام کے قانونِ بغاوت کی ضروری تفصیل پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بتا چکا ہوں کہ جرمِ بغاوت کے ثابت و متحقق ہونے کے لیے ضروری ہے کہ مجرمین کا ارادہ یہ ہو کہ وہ نظامِ حکومت کو انقلابی اور تشددانہ ذرائع سے تہ و بالا کر دیں اور امامِ عادل کے خلاف مسلح خروج کے مرتکب ہوں۔ اس کے ساتھ یہ بھی لابدی ہے کہ مجرم ایسی مادی طاقت و سطوت و منعۃ کے مالک ہوں اور اتنی جمعیت اور آلاتِ حرب رکھتے ہوں کہ قتال بالسیف کے بغیر ان کا قلع قمع نہ ہو سکتا ہو۔ میں پوچھتا ہوں کہ حضرت حجرؓ جن کے بارے میں حضرت عدیؓ کا یہ قول عثمانی صاحب نے خود نقل کیا ہے کہ "مجھے گمان نہ تھا کہ یہ بیچارہ (حجرؓ) ضعف کے اس درجے کو پہنچ گیا ہو گا جو میں دیکھ رہا ہوں" اور جن کے بارے میں مؤرخین کا بیان ہے کہ زیاد کی پولیس سے فرار کے وقت وہ بغیر سہارے کے سواری پر جم کر بیٹھ بھی نہ سکتے تھے، ایسے شیخ فانی اور ان کے چند ساتھی جو ان کے پاس مسجد یا گھر میں جمع ہو جاتے تھے، کیا ان پر فئۃ کی شرعی اصطلاح کا اطلاق کسی لحاظ سے بھی درست ہو گا؟ کیا یہ کوئی ایسی زبردست اور ناقابلِ تسخیر جمعیت تھی جس کے خلاف فوج کشی کی گئی تھی؟ حقیقت یہ ہے کہ پولیس ایکشن کے ذریعے سے ان کی سرکوبی اور گرفتاری اسی لیے تو ممکن ہوئی کہ وہ تعداد یا اسلحہ کے لحاظ سے کوئی طاقتور اور صاحبِ مَنَعَت گروہ تھے ہی نہیں۔ حضرت حجرؓ کے حالات کے تحت استیعاب میں مسروقؒ کی روایت حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضرت عائشہؓ کو یہ کہتے ہوئے سنا: لو علم معاویۃ ان عند اھل الکوفۃ مَنَعَۃ ما اجترأ علی ان یأخذ حُجراً واصحابہ من بینھم حتی یقتلھم بالشام۔ "اگر معاویہ کو یہ معلوم ہوتا کہ اہلِ کوفہ کوئی طاقت رکھتے ہیں تو وہ اس بات کی جرأت نہ کرتے کہ حجرؓ اور ان کے رفقاء کو ان کوفے والوں کے درمیان سے پکڑ لیتے اور شام میں لے جا کر انہیں قتل کر دیتے۔" گویا کہ حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھی تو درکنار حضرت عائشہؓ کے نزدیک سارے کوفے والے مل کر بھی اہلِ مَنَعہ نہیں تھے۔ جن پر باغیوں کا اطلاق ہو سکتا۔ مگر ہمارے مفتی صاحب ان کے باغی اور لائقِ قتل ہونے کا فتویٰ دے رہے ہیں! پھر ان باغیوں کا حال یہ تھا کہ ان چودہ آدمیوں کو پابندِ سلاسل کرنے کے بعد صرف دو آدمی انہیں بھیڑوں کی طرح ہانک کر دمشق تک اور پھر وہاں سے مرج عذراء[1]

---

[1] مرج عذراء کا علاقہ وہ ہے جو سب سے پہلے حضرت حجرؓ بن عدی ہی کے ہاتھ پر فتح ہو کر اسلامی سلطنت میں شامل ہوا تھا۔ تاریخوں میں منقول ہے کہ اس دیار میں سب سے پہلے تکبیر بلند کرنے والے وہی تھے اور تقدیر میں یہ لکھا تھا کہ اسی مقام پر یہ قتل بھی کیے جائیں۔

کے جنگل تک لے گئے اور وہاں آدھوں کو ذبح کر دیا گیا لیکن ان کے مفرور اور رُوپوش ساتھیوں یا دوسرے ہوا خواہوں میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ پہنچا، نہ قتل کے بعد ہی کسی نے حرکت کی۔ یہ وہ باغی ہیں جن کے بارے میں یہ فرمایا گیا کہ اگر یہ قتل نہ ہوتے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ آدمیوں کو قتل کرنا پڑتا!

ان "باغیوں" کی جو جھڑپ کندہ میں زیاد کی پولیس سے ہوئی ہے اور اس میں جو زد و خورد ہوئی ہے اُسے "البلاغ" میں ایک باقاعدہ جنگ سے تعبیر کیا گیا جس میں لاٹھیاں اور پتھر استعمال ہو رہے تھے اور رزمیہ اشعار پڑھے جا رہے تھے"۔ یہ بھی یاد رہے کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جبکہ ہر گھر میں تیر، تلوار، برچھے، نیزے تیار رہتے تھے۔ مگر فریقین نے لڑائی بھی لڑی تو پتھر یا لاٹھی سے جو اسلحہ یا آلۂ جارحہ کی تعریف ہی میں نہیں آسکتے۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ جہاں تک حضرت حُجرؓ اور ان کے ساتھیوں کا تعلق ہے، وہ آلاتِ حرب سے اس لیے مسلح نہ تھے کہ وہ باقاعدہ جنگ کی طاقت اور نیت نہیں رکھتے تھے اور زیاد کے آدمی اسلحہ سے اس لیے لیس نہیں ہوتے کہ انہوں نے اس کا استعمال غیر ضروری سمجھا اور اس کے بغیر ہی شورش کو فرو کر لیا۔ اس مٹھ بھیڑ اور پکڑ دھکڑ کی جو تفصیل تاریخوں میں بیان ہوئی ہے، اس سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس میں کوئی شخص قتل ہوا ہو یا بُری طرح مجروح ہی ہوا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سے شدید ترلڑے اور فسادات ہر دَور، ہر زمانے میں ہوتے رہے ہیں، لیکن ان پر کبھی بھی "بغاوت" کا اطلاق نہیں کیا گیا۔ خود ہماری مملکت پاکستان میں ابھی تھوڑے دن پہلے پولیس کے لاٹھی چارج کا جواب جن لوگوں نے اینٹ پتھر سے دیا اور سیاسی نعرے بھی لگائے، کیا مفتی زادہ جناب عثمانی صاحب ان کے متعلق یہ فتوٰی دیں گے کہ وہ سب شرعی اصطلاح میں باغی اور واجب القتل تھے؟ عقل دنگ ہے کہ شرعی قوانین کی یہ نئی اور انوکھی تعبیرات کس علمی زعم کی بنا پر فرمائی جا رہی ہیں؟ پہلے یہ کہا گیا کہ حکام اور گورنروں پر قصاص، تعزیر یا تاوان نہیں خواہ وہ جورِ صریح کے مرتکب ہوں۔ دیت اور تاوان بھی دیا جائیگا تو حاکم کی ذات سے نہیں بلکہ عامۃ المسلمین کی جیب سے یعنی بیت المال سے دیا جائے گا۔[1] اب یہ فرمایا جا رہا ہے

[1] ابن غیلان کے ہاتھ کاٹ دینے اور اُسے مواخذہ سے بالاتر قرار دینے کے حق میں جو نادر دلائل البلاغ میں پیش کیے گئے ہیں، میں جب انہیں پڑھ رہا تھا تو مجھے بے اختیار وہ دلائل یاد آ رہے تھے جو اُس پولیس آفیسر کے وکلاءِ صفائی نے پیش کیے ہیں جس کے خلاف لاہور کے ایک معروف عالمِ دین کو ٹھوکریں مارنے اور مجروح کرنے کے الزام میں مقدمہ چل رہا ہے؟

کہ جو شخص حکومت کے خلاف ہو، انتشار برپا کرنا چاہتا ہو" سب و شتم کا جواب سب و شتم سے دے، گرفتاری کے لیے اپنے آپ کو پیش کرنے کے بجائے مزاحمت کرے یا رُوپوش ہو جائے۔ اس کا جُرم بغاوت سے کم نہیں ہے اور اس کی سزا قتل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ جرائم جن کو بغاوت کا نام دیا جا رہا ہے اور جن پر مسلمان کا خون هدر قرار دیا جا رہا ہے، ان جرائم پر تو ایک ذمی کا خون بہانا بھی اسلام نے جائز نہیں سمجھا ہے اور اسے اپنے ذمے سے خارج نہیں کیا ہے۔ اگر اس طرح کے مفتیوں کو حکومت یا عدالت کی کرسی پر بٹھا دیا جائے تو قانونِ اسلامی بازیچۂ اطفال بن کر رہ جائے گا اور مسلمانوں کو یہاں وہ حقوق و تحفظات بھی حاصل نہ رہ سکیں گے جو ایک اسلامی حکومت میں کفار اور اہلِ ذمہ کو حاصل ہو سکتے ہیں۔ عثمانی صاحب سے میری گزارش ہے کہ وہ براہِ کرم اپنے والد ماجد مفتی محمد شفیع صاحب سے یہ استفتا فرمائیں کہ اگر آج کوئی گورنر مسلمانوں کے مجمعِ عام میں اُٹھ کر تقریر کرے اور اس میں حضرت علیؓ کو بُرا بھلا کہے، اور اس پر کچھ مسلمان صبر نہ کر سکیں اور گورنر پر جوتوں کی بارش کریں، اور گورنر جب ان کو گرفتار کرنے کے لیے پولیس بھیجے تو وہ پولیس کا مقابلہ لاٹھیوں اور پتھروں سے کریں، تو کیا وہ سب باغی اور واجب القتل ہوں گے؟ مفتی صاحب اس کے جواب میں جو فتویٰ دیں وہ براہِ کرم البلاغ میں شائع کر دیا جائے۔

میں مدیر البلاغ کو مشورہ دُوں گا کہ وہ تعزیراتِ پاکستان کی دفعہ ۱۲۴ اور ۱۲۴الف کا ذرا مطالعہ فرمائیں۔ یہ قوانین ایک کافر، اجنبی اور فاتح قوم نے ایک مغلوب و مفتوح قوم پر نافذ کرنے کے لیے بنائے تھے۔ ان میں سامراجی اقتدار و تسلّط کو مستحکم کرنے اور قائم رکھنے کا پُورا پُورا اہتمام کیا گیا تھا اور محکوم اقوام کے شہری حقوق کم سے کم تجویز کیے گئے تھے۔ دفعہ ۱۲۴ کے تحت صدر یا گورنر کو بزور اپنے فرائض و اختیارات کے استعمال سے روکنا، ان میں مخل ہونا اور ان پر حملہ آور ہونا فوجداری جُرم ہے اور اس کی زیادہ سے زیادہ سزا سات سال قید ہے۔ اس کے بعد دفعہ ۱۲۴ الف ہے، جس میں حکومت کے خلاف نفرت، حقارت اور عدمِ

---

* دلائل یہی تھے کہ اس افسر سے مواخذہ قانوناً جائز نہیں، کیونکہ اس نے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مزاحم ہونے والوں سے یہ سلوک کیا تھا جس میں وہ حق بجانب تھا۔ اچھا ہوا کہ البلاغ کے دلائل وکیلِ صفائی کے ہاتھ نہ لگے ورنہ وہ شرعاً اس پولیس افسر کو حق بجانب اور ان عالمِ دین کو مجرم ثابت کرنے میں انہیں بھی کام میں لاتا۔

وفاداری کے جذبات ظاہر کرنے اور پھیلانے کو بغاوت قرار دیا گیا ہے، مگر اس کی سزا بھی موت نہیں، بلکہ زیادہ سے زیادہ حبسِ دوام کی سزا تجویز کی گئی ہے۔ اور اس دفعہ کی توضیح میں یہ بات بھی درج ہے کہ جائز قانونی ذرائع سے کام لے کر حکومت کے اقدامات پر تنقید کرنا اور ان میں تبدیلی کا مطالبہ کرنا جرم نہیں ہے۔ اب قوانینِ شرعیہ کی جو تفسیر و تشریح عثمانی صاحب پیش فرما رہے ہیں، اس کی رو سے ان دونوں دفعات میں ترمیم کر کے ان میں زیادہ سے زیادہ سزا لازماً موت مقرر کرنی ہو گی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔

گر ہمیں مکتب و ہمیں مُلّا ۔۔۔ کارِ طفلاں تمام خواہد شد

حضرت حجرؓ کا مقدمہ اور اس کی رُوداد | حضرت حجرؓ اور آپ کے ساتھیوں کے جرائم کی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد اب یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ ان کے خلاف بغاوت کا جو مقدمہ بنایا گیا اور جس طرح شہادتیں فراہم کی گئیں، ان میں کہاں تک اسلام کے قانونِ قضا اور عدل و انصاف کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا گیا۔ تاریخ طبری جلد ۴ میں صفحہ ۱۹۰ سے لے کر صفحہ ۲۰۸ تک اس واقعہ کی پوری تفصیلات موجود ہیں۔ ان صفحات کا حوالہ عثمانی صاحب نے بار بار دیا ہے اور مولانا مودودی پر ضروری باتیں حذف کرنے کا الزام لگا کر کہا ہے کہ "ہم ان باتوں پر تنبیہ کریں گے"۔ اب جن اجزاء کو انہوں نے خود حذف کیا ہے اور بحث و تنقیح کے جن ضروری پہلوؤں کو نظر انداز کیا ہے، میں بھی ان کی نشان دہی کیے دیتا ہوں۔ طبری میں ص ۱۹۹ پر یہ بات درج ہے کہ زیاد نے حضرت حجرؓ کے بارہ ساتھیوں کو جیل میں ڈال دیا اور پھر محلوں کے سرداروں کو بلا کر کہا کہ "حجر کے بارے میں تم نے جو کچھ دیکھا ہے، اس کی شہادت دو"۔ لیکن اس پوری بحث میں یہ بات کسی جگہ مذکور نہیں ہے کہ شہادت کے وقت حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو بھی اپنا بیان یا صفائی پیش کرنے یا کسی گواہ پر جرح کرنے کا موقع دیا گیا ہو۔ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ سے روایت ہے:

قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الخصمین یقعدان بین یدی الحاکم۔	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ (یعنی عدالتی ضابطہ بیان) فرمایا ہے کہ مقدمے کے فریقین دونوں حاکم کے رُوبرو بیٹھیں۔

آنحضورؐ نے مزید فرمایا:

فاذا جلس بین یدیك الخصمان فلا تقض حتی تسمع کلام الآخر کما سمعت کلام الاول۔

جب دونوں فریق تمہارے سامنے بیٹھ جائیں تو فیصلہ نہ کرو جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لو جس طرح تم نے پہلے کی بات سنی۔

حضرت عمرؓ نے جو ہدایت نامہ آدابِ قضا سے متعلق حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھیجا تھا، وہ متعدد کتبِ فقہیہ میں منقول ہے، اس میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

سوّ بین الناس فی وجهك ومجلسك حتی لا ییأس الضعیف من عدلك ولا یطمع الشریف فی حیفك۔

تم لوگوں کی جانب متوجہ ہونے اور اپنا اجلاس منعقد کرنے میں مساوات قائم کرو تاکہ کمزور تمہارے عدل سے مایوس نہ ہو اور بڑے خاندان والا تم سے بے انصافی کی طمع نہ کرے۔

ملزمین کے خلاف ان کی غیر موجودگی میں گواہیاں لینا ارشاداتِ نبویؐ اور اسلامی اصولِ قضاء کے بالکل خلاف ہے۔ اس پر اُس شہادت کا اطلاق ہی نہیں ہو سکتا جو اثباتِ جُرم کے لیے بنیاد بن سکے۔ پھر اسلامی قانونِ شہادت کے مطابق یہ بھی ضروری ہے کہ ہر گواہ کی گواہی الگ الگ لی جائے تاکہ پہلے کی گواہی سے دوسرا متاثر نہ ہو اور ان کی شہادت میں اگر اختلاف ہو جو ملزم کے حق میں مفید ہو، تو وہ اس فائدے سے محروم نہ ہو[1]۔ لیکن زیاد کے سامنے چار اصحاب کی گواہی جس طرح تاریخ میں درج ہے، جسے عثمانی صاحب نے بھی نقل کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سب گواہوں نے بیک زبان اور بیک وقت ایک ہی گواہی دی ہے۔ تاہم اگر عثمانی صاحب کے وضع کردہ اصولِ عدمِ ذکر و ذکرِ عدم" کے تحت اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ سب شہادتیں باری باری سے ملزمین کے سامنے پیش ہوئی تھیں اور انہیں بھی صفائی یا جرح کا موقع دیا گیا تھا مگر تاریخ میں ساری تفصیلات کو حذف کر کے صرف شہادت کا وہ مضمون بیان کر دیا گیا ہے جو تمام گواہوں کے مابین قدرِ مشترک تھا، تب بھی اس شہادت سے جرمِ بغاوت ہرگز ثابت نہیں ہوتا۔ چاروں حضرات کی گواہی البلاغ میں یوں نقل کی گئی ہے:

---

[1] معین الحکام ص۶۱ پر ادب القاضی للخصاف کے حوالے سے درج ہے۔ لو شهد شاهد وفسر الشهادة ثم شهد الآخر فقال اشهد علی مثل شهادة صاحبی لا یقبل (اگر ایک گواہ شہادت دے اور اس کی تفصیل بیان کرے، پھر دوسرا گواہ کہے کہ میں اپنے ساتھی کی گواہی کے مثل گواہی دیتا ہوں تو دوسرے کی گواہی قبول نہ ہو گی)۔

"حجرؓ نے اپنے گرد جتھے جمع کر لیے ہیں اور خلیفہ کو کھلم کھلا گالیاں دی ہیں اور امیر المومنین کے خلاف جنگ کرنے کی دعوت دی ہے اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ آلِ ابی طالب کے سوا خلافت کا کوئی مستحق نہیں[1]۔ انہوں نے ہنگامہ برپا کر کے گورنر کو نکال باہر کیا اور یہ ابوتراب (حضرت علیؓ) کو معذور سمجھتے اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں اور ان کے دشمن اور ان سے جنگ کرنے والوں سے برات کا اظہار کرتے ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں، وہ ان کے ساتھیوں کے سرگروہ ہیں اور انہی جیسی رائے رکھتے ہیں۔"

اس شہادت میں حضرت حجرؓ بن عدی اور آپ کے ساتھیوں کے جو جرائم بیان ہوئے ہیں، میں ان پر تفصیلی بحث کر چکا ہوں۔ ان میں سے کوئی جرم بلکہ ان کا مجموعہ مل کر بھی بغاوت کی شرعی و اصطلاحی تعریف میں نہیں آسکتا۔ پھر ہر فعل کو اپنے پس منظر سے کاٹ کر مبالغے اور رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ گورنر کو نکال باہر کرنے والی بات تو بالکل خلافِ واقعہ ہے جو کسی تاریخ میں میری نظر سے نہیں گزری۔ گورنر کو نکال دینا تو درکنار خود حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھی گرتے پڑتے بڑی مشکل سے جان بچا کر بھاگے اور روپوش ہوئے تھے اور پھر زیاد سے امان لے کر خود ہی حاضر ہو گئے تھے۔ بہر کیف ان چار اصحاب کی شہادت نقل کرنے کے بعد عثمانی صاحب لکھتے ہیں :

"پھر زیاد نے چاہا کہ ان چار حضرات کے علاوہ دوسرے لوگ بھی اس گواہی میں شریک ہوں چنانچہ اس نے ان حضرات کی گواہی لکھ کر لوگوں کو جمع کیا، ان کو یہ گواہی پڑھ کر سنائی اور لوگوں کو دعوت دی کہ جو لوگ اس گواہی میں شریک ہونا چاہیں، وہ اپنا نام لکھوا دیں۔ چنانچہ لوگوں نے نام لکھوانے شروع کیے، یہاں تک کہ ستر افراد نے اپنے نام لکھوائے۔"

شہادت فراہم کرنے کے اس طریقِ کار کو اگر کھینچ تان کر کے کسی طرح حدِ جواز میں لایا جا سکتا ہو، تب بھی میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ گواہیاں لینے کا یہ طریقہ اسلامی عدل و انصاف کے بنیادی اور معیاری تصورات

---

[1] واضح رہے کہ یہ بات علی الاطلاق صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ وہ لوگ حضرت ابوبکرؓ و عمرؓ کی خلافت کو صحیح مانتے تھے اور حضرت عثمانؓ کی بھی خلافت پر نہیں بلکہ ان کے بعض اعمال پر معترض تھے۔ اس لیے ان کی صحیح پوزیشن یہ تھی کہ وہ حضرت معاویہؓ کے مقابلہ میں حضرت علیؓ اور ان کے صاحبزادوں کو خلافت کا مستحق سمجھتے تھے۔

سے بالکل فروتر ہے۔ آخر سیاسی اجتماعات اور پبلک جلسوں میں قراردادوں کی منظوری لینے، محضرناموں پر لوگوں کے انگوٹھے لگوانے یا دستخط لینے اور مسلمانوں کی زندگی اور موت کا فیصلہ کرتے وقت گواہوں کی شہادت ریکارڈ کرنے میں کچھ تو فرق و امتیاز ہونا چاہیئے۔ ہمارے فقہاء نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ کسی گواہ کو کوئی خاص قسم کی "تلقین" نہ کی جائے جو اس کی آزادانہ رائے پر اثر انداز ہوسکتی ہو۔ چنانچہ امام سرخسیؒ مبسوط جلد ۹ صـ۱۰۲ پر فرماتے ہیں ولا ینبغی للقاضی ان یلقن الشھود ما تتم بہ شھادتھم فی الحدود لانہ مامور بالاحتیال لدرء الحد لا لاقامتہ (قاضی کو چاہیے کہ وہ گواہوں کو ایسی بات نہ سمجھائے جس سے ان کی شہادت حدود میں پایۂ تکمیل و ثبوت تک پہنچے۔ کیونکہ قاضی اس بات پر مامور ہے کہ کسی بہانے سے حد کو ٹالے، نہ کہ اسے قائم کرے)۔ اِس کی روشنی میں ہم یہ بآسانی فیصلہ کرسکتے ہیں کہ ایک پیشگی لکھی لکھائی "گواہی" تیار کرلینا اور صوبے کے گورنر کا لوگوں کو بلاکر یہ کہنا کہ اس گواہی میں کون کون شریک ہوتا ہے، شہادت فراہم کرنے کا یہ طریقہ اسلامی انصاف کے تقاضے کہاں تک پورے کرسکتا ہے۔ یہ حرکت تو اِس ظلم و ستم کے دور میں بھی اگر کوئی گورنر کرے تو دنیا چیخ اُٹھے۔

یہاں یہ بات بھی لائقِ وضاحت ہے کہ عثمانی صاحب نے یوں تو بہت سی غیر ضروری تفصیلات اور مکالمات وغیرہ کو تاریخ طبری سے نقل کردیا ہے، لیکن جس مقام پر مندرجہ بالا گواہی لیے جانے کا ذکر ہے، وہاں سے بعض نہایت ضروری اجزاء کو حذف کردیا ہے۔ امام ابن جریرؒ نے اسی جگہ (ج ۴، صـ۲۰۱) پر لکھا ہے کہ پہلے ایک گواہ (ابو بُردہ) سے گواہی لی گئی۔ پھر جو کچھ ہوا، وہ درج ذیل ہے:

فقال زیاد علی مثل ھذہ الشھادۃ فاشھدوا اما واللہ لاجھدن علی قطع خیط عنق الخائن الاحمق فشھد رؤوس الارباع علی مثل شھادتہ وکانوا اربعۃ ثم ان زیاداً دعا الناس فقال اشھدوا علی مثل شھادۃ رؤوس الارباع فقرأ علیھم الکتاب۔

"پھر زیاد نے کہا کہ اِس شہادت کے مانند شہادت دو۔ خدا کی قسم میں اس خائن و احمق کی رگِ گردن کاٹنے کی پوری جدوجہد کروں گا۔ پس محلّوں کے سرداروں نے اسی شہادت کے مطابق گواہی دی اور وہ چار تھے۔ پھر زیاد نے لوگوں کو بلایا اور کہا کہ جس طرح محلّوں کے سرداروں نے شہادت دی ہے، اسی طرح کی شہادت دو اور انہیں وہ تحریری شہادت پڑھ کر سنائی۔

دوسرے لفظوں میں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زیاد صرف گرفتاری سے پہلے ہی قاتلانہ دھمکیاں نہیں دیتا رہا (جیسے عثمانی صاحب بھی نقل کر چکے ہیں)، بلکہ وہ حضرت حُجرؓ کے خلاف جس وقت شہادتیں لے رہا تھا اُس وقت بھی ایک قصّاب کی طرح اپنی نیّت اور ارادے کا برملا اظہار کر رہا تھا کہ میں اس احمق اور غدار کو تہِ تیغ کرنے میں پُورا زور لگاؤں گا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا بلکہ ایک گواہی پڑھ کر سُنا رہا تھا کہ تم لوگ اس طرح کی گواہی دو۔ ابن جریرؒ کی تصریح کے مطابق اس کے بعد ستّر گواہوں نے ویسی ہی گواہی دی۔ اس ساری رُوداد کو پڑھتے ہوئے آدمی یہ کہنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ایوب خاں کا گورنر عبدالمنعم خاں بھی اتنی دُور تک نہ جا سکا جہاں تک عثمانی صاحب کا یہ ممدوح گورنر پہنچ گیا۔

اسلامی قانونِ شہادت کی مزید خلاف ورزی پھر مزید ایک واقعہ جو تاریخ طبری اور دوسری تاریخوں میں مذکور ہے اور جسے البلاغ میں نظر انداز کر دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ ان گواہوں میں مشہور قاضی شُریح بن حارث اور شُریح بن ہانی دونوں کا نام بھی زیاد نے درج کر دیا تھا۔ قاضی شُریح کا اپنا بیان تاریخ طبری اور البدایہ والنہایہ میں یہ درج ہے کہ میں نے گواہی صرف یہ دی تھی کہ حُجرؓ ایک عبادت گزار اور روزے دار شخص ہیں۔ اور شُریح بن ہانی کا یہ قول منقول ہے کہ "مجھے معلوم ہوا ہے کہ میرا نام گواہوں میں درج کر دیا گیا ہے اور میں نے اس کی تردید کرتے ہوئے زیاد کو ملامت کی ہے"۔ صرف یہی نہیں بلکہ ابن جریرؒ نے آگے صفحہ ۲۰۲ پر بیان کیا ہے کہ جب زیاد نے حضرت حُجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو حضرت وائل اور کثیرؓ بن شہاب کی حراست میں امیر معاویہؓ کی طرف روانہ کیا اور ساتھ وہ "شہادت نامہ" بھی بھیجا تو شُریح بن ہانی راستے میں انہیں جا ملے اور کثیرؓ کے حوالے ایک بند مکتوب کیا جو امیر معاویہؓ کے نام تھا۔ کثیرؓ نے اس کا مضمون پوچھا تو شُریح نے بتانے سے انکار کر دیا۔ اس پر کثیر گھبرائے کہ معلوم اس میں کوئی ایسی بات ہو جو امیر معاویہؓ کو ناپسند ہو اور وہ خط لینے پر آمادہ نہ ہوئے۔ پھر شُریح نے وہ خط حضرت وائل کے سپرد کر دیا اور انہوں نے امیر معاویہؓ تک پہنچا دیا۔ امیر معاویہؓ نے اسے کھولا تو اس میں شُریح کی جانب سے تحریر تھا "مجھے معلوم ہوا ہے کہ زیاد نے حُجرؓ کے خلاف میری شہادت بھی درج کر کے بھیجی ہے۔ میری شہادت یہ ہے کہ وہ نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں، ہمیشہ حج و عمرہ کرتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں برائی سے روکتے ہیں۔ اُن کے خون اور مال پر دست درازی حرام ہے"۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ زیاد نے جعل سازی اور شہادتِ زُور کے کبیرہ گناہ کا ارتکاب کیا تھا اور گواہوں کو سکھانے پڑھانے کی ہر کوشش کے باوجود اس نے جب دیکھا کہ بعض گواہ اس کے مطلب کی گواہی نہیں دیتے تو اس نے ان کی طرف سے جھوٹی گواہی گھڑ کر درج کر دی۔ زیاد کی یہ مجرمانہ حرکت گواہیوں کے اِس سارے دفتر کو مشتبہ اور ناقابلِ وثوق بنا دیتی ہے۔ کیونکہ جو شخص ایک گواہ پر بہتان باندھ سکتا ہے، وہ ایک سے زاید پر بھی باندھ سکتا ہے۔ مولانا عثمانی صاحب نے ابن خیلان کو شک کا فائدہ دے کر بری الذمہ ثابت کرنے میں تو بڑا زور صرف کیا تھا، مگر یہاں حضرت حُجرؓ کے معاملے میں معلوم نہیں ملزم کو شک کا فائدہ ملنے کا اصول کہاں غائب ہو گیا؟ پھر عجیب تر بات یہ ہے کہ امیر معاویہؓ نے اس صورتِ حال کے سامنے آجانے پر بھی یہ ضروری خیال نہ فرمایا کہ شُریح یا دوسرے گواہوں کو یا زیاد کو بلا کر ملزمین کے سامنے بیان لیے جاتیں اور ملزمین کو بھی بیان اور جرح کا موقع دیا جائے[1]۔ بلکہ دو گواہ جو قیدیوں کو ساتھ لائے تھے ان کے اور قیدیوں کے بیان بھی آمنے سامنے نہیں لیے گئے اور بس زیاد کی بھیجی ہوئی گواہی اور رپورٹ پر قتل کا فیصلہ کر ڈالا گیا، حالانکہ زیاد کی تحریر کی حیثیت ایک تفتیشی افسر کی ڈائری سے زیادہ کی نہیں تھی اور جب تک باقاعدہ عدالتی کارروائی کے مطابق اُسے فریقین کے سامنے ثابت نہ کیا جاتا، اس پر شہادت کا اطلاق نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس پوری کارروائی کے دوران میں ایک مرتبہ بھی زیاد یا امیر معاویہؓ نے ملزموں کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اپنا بیان دے سکیں یا اپنے خلاف گواہی سُن سکیں یا کسی گواہ پر جرح کر سکیں۔ بلکہ انہیں آخر وقت تک یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ کس انجام سے دوچار ہونے والے ہیں۔ تاریخ طبری (ج ۴، ص ۲۰۳) میں تصریح ہے کہ جب سارے ملزم مَرجِ عذراء کے مقام پر محبوس کر دیئے گئے تو وہاں انہیں یزید بن حجیہ کے ذریعے سے معلوم ہوا کہ انہیں قتل کی سزا

---

[1] گواہوں کی گواہی کے وقت ملزموں کی موجودگی جس طرح دوسرے عدالتی نظاموں میں لازم ہے، اسی طرح اسلام میں بھی ہے۔ شہادت علی الغائب اور قضاء علی الغائب بعض خاص صورتوں کے ماسوا جائز نہیں۔ موجودگی کے ساتھ گواہوں کے لیے جرح کا حق بھی مسلّم ہے، جس کے بغیر شہادت ناقابلِ اعتماد ہے۔ حضرت مغیرہؓ پر خلافتِ فاروقی میں زنا کا جو مقدمہ قائم ہوا تھا وہ حضرت مغیرہؓ کی گواہوں پر جرح ہی کے باعث ثابت نہ ہو سکا تھا اور اُلٹا گواہوں پر حدِ قذف جاری کی گئی تھی، حالانکہ گواہوں میں صحابی بھی تھے۔

ملنے والی ہے۔ اس پر حضرت حجرؓ نے یزید سے کہا کہ وہ امیر معاویہ سے جا کر کہیں کہ "ہم اپنی بیعت پر قائم ہیں۔ ہمارے خلاف گواہی عداوت و اتہام پر مبنی ہے"۔ یزید نے یہ پیغام پہنچا دیا مگر امیر معاویہؓ نے اس کے جواب میں فرمایا زیاد اصدق عندنا من حجر (زیاد ہمارے نزدیک حجرؓ سے زیادہ سچا ہے)۔

عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ زیاد نے "گواہیوں کا صحیفہ شرعی اصول کے مطابق حضرت وائل اور حضرت کثیرؓ کو دیا کہ وہ حضرت معاویہؓ کو پہنچائیں۔ معلوم نہیں "شرعی اصول کے مطابق صحیفہ پہنچانے" سے مراد کیا ہے؟ میں سمجھتا ہوں کہ عثمانی صاحب غالباً اسے "کتاب القاضی الی القاضی" یا "شہادۃ علی الشہادۃ" کے فقہی قاعدے کے تحت لا کر اس کارروائی کو شرعی اصول کے مطابق قرار دینا چاہتے ہیں۔ یہ "شہادت" جیسی کچھ بھی تھی اور جیسے کچھ "آدابِ قضا" کو ملحوظ رکھتے ہوئے حاصل کی گئی تھی، اس پر تو میں اوپر روشنی ڈال ہی چکا ہوں۔ مگر میں عثمانی صاحب پر یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ اول تو انتظامی حاکم، یعنی گورنر کو قاضی قرار دینا ایک انوکھی اپچ ہے، پھر فقہائے حنفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ کتاب القاضی الی القاضی یا شہادۃ علی الشہادۃ غیر فوجداری یعنی دیوانی و مالی (CIVIL) معاملات ہی میں معتبر ہے، حدود و قصاص یعنی فوجداری (CRIMINAL) معاملات میں ہرگز معتبر نہیں ہے۔ وہ فقہ کی کوئی کتاب اٹھا کر خود ہی دیکھ لیں، میں حوالے کہاں تک نقل کرتا رہوں۔ فقہائے حنفیہ نے اس کی وجہ بھی بیان کر دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایک قاضی کے مکتوب کا دوسرے کے لیے قابلِ قبول ہونا اور اسی طرح ایک شاہد کا دوسرے شاہد کی شہادت کو پیش کرنا خلافِ قیاس ہے اور اسے صرف استحساناً جائز سمجھا گیا ہے۔ ورنہ یہ دونوں "شبہ" سے خالی نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تحریر اصل قاضی کے بجائے کسی غیر کی ہو یا شہادت نقل کرنے میں سہو ہو جائے، اور فوجداری جرائم میں بیانات و شہادت کا ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہونا ضروری ہے۔ اس لیے زیاد کا جو مکتوب اور گواہیوں کا جو صحیفہ امیر معاویہؓ کے پاس پہنچا تھا، وہ اس اصول کے مطابق بھی ہرگز کسی قانونی قدر و قیمت کا حامل یا اعتماد کے لائق نہ تھا۔ لیکن حیرت بالائے حیرت ہے کہ مدیر البلاغ پھر بھی فرماتے ہیں کہ "حضرت معاویہؓ کو حجرؓ کی شورشوں کا پہلے ہی علم تھا، اب ان کے پاس چوالیس قابلِ اعتماد گواہیاں ان کی باغیانہ سرگرمیوں پر پہنچ گئیں۔ جرمِ بغاوت کو ثابت کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ جرم روزِ روشن کی طرح ثابت ہو گیا اور بغاوت کی سزا موت ہے"۔ اس ارشاد سے مدیر البلاغ نے اصولِ فقہ میں ایک اور نادر اضافہ فرمایا ہے،

...دہ یہ ہے کہ حاکم کے فیصلے میں کسی شخص کے متعلق اس کے مجرم ہونے کا پیشگی علم بھی جائز طور پر دخیل ہو سکتا ہے۔
... بات ہے جو اسلامی فقہ تو درکنار، دنیا کے کافرانہ قوانین تک میں غلط سمجھی جاتی ہے۔

ع بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

پھر عثمانی صاحب لکھتے ہیں "اس کے باوجود حضرت معاویہؓ نے بعض صحابہؓ کے کہنے پر چھ افراد کو چھوڑ دیا اور آٹھ کو قتل کرنے کا حکم دیا"۔ سوال یہ ہے کہ اس دو گونہ اور امتیازی سلوک کی وجہ کیا ہے؟ مجھے معلوم ہوا ہے کہ عثمانی صاحب نے اس سوال کا نیا جواب بعض پوچھنے والوں کو یہ دیا ہے کہ باغی کا قتل واجب نہیں، صرف جائز ہے، اس لیے امیر معاویہؓ نے جسے چاہا قتل کرا دیا جسے چاہا معاف کر دیا ع ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے! اس کے معنی تو یہ ہیں کہ عثمانی صاحب حضرت معاویہؓ کو ماشاء اللہ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ کے مقامِ عالی پر فائز کرنا چاہتے ہیں اور یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ معاملہ عدالت کا نہیں مشیت کا تھا!

میں یہ حقیقت کھول کر بیان کر چکا کہ اوّل تو یہ اصحاب ہرگز باغی نہ تھے، اور بالفرض اگر تھے بھی تو گرفتار ہو جانے کے بعد مجرد جرمِ بغاوت کی سزا ہرگز قتل نہیں ہے۔ اب میں عثمانی صاحب سے مطالبہ کرتا ہوں کہ وہ چبا چبا کر بات کرنے کے بجائے صاف صاف بتائیں کہ انہوں نے یہ اصول کہاں سے اخذ کیا ہے کہ باغی اسیر کا قتل واجب تو نہیں مگر جائز ہے؟ یہ قتل کا جواز ان کی تحقیق میں حد کے تحت آتا ہے یا تعزیر کے تحت؟ مجرموں کا جرم اور ان کے خلاف شہادت یکساں ہو تو بعض کو چھوڑنا اور بعض کی گردن مار دینا کیا معنی رکھتا ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ حجرؓ ان کے سرغنہ تھے تو فقط اُن کا جرم شدید تر تھا، باقی تو جرم میں برابر تھے، پھر اُن میں سے بھی صرف چند کا انتخاب برائے قتل کس بنا پر ہوا؟ واقعہ یہ ہے کہ جن لوگوں کو رہا کیا گیا، اس بنا پر کیا گیا کہ ان کی کسی دوست یا عزیز نے سفارش کر دی۔ حالانکہ قصاص و حدود میں شفاعت کرنا اور اُسے مان لینا اسلامی نقطۂ نظر سے ہرگز جائز نہیں ہے۔ پھر عجیب تر چیز یہ ہے کہ جن لوگوں کے نام زیاد کی رپورٹ میں بطورِ گواہ درج تھے، انہی میں سے بعض حضرات ایسے ہیں جنہوں نے بعض ملزموں کی سفارش کر کے انہیں رہا بھی کرایا ہے۔ پھر جو سفارش بھی کی گئی، اس بنا پر نہیں کہ فلاں شخص بے گناہ یا بے ضرر ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ یہ ہمارا آدمی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ دورِ ملوکیت کے خصائص میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ایک طرف ملزم کے خلاف شہادت دی جائے، دوسری طرف اُسے چھڑانے کیلئے سفارش کی جائے اور اُسے قبول بھی کر لیا جائے اور جس کا کوئی سفارشی نہ ہو اُسے قتل کر دیا جائے۔ اسلام کے تصورِ عدل و انصاف کے ساتھ اس سے بڑا اور سنگین تر استہزاء اور کیا ہو سکتا ہے؟

(باقی)

مراکش کی تعلیمی کانفرنس کی رُوداد

(جناب خلیل حامدی صاحب)

مراکش کے تاریخی شہر فاس میں (جسے انگریزی میں FEZ اور اردو اخبارات فیض لکھتے ہیں) ایک اہم تعلیمی کانفرنس ۱۲ ستمبر تا ۱۹ ستمبر ۱۹۶۹ء منعقد ہوئی۔ اس کانفرنس میں ۱۶ مسلم اور غیر مسلم ملکوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ اس کا انتظام مراکش کی وزارتِ ثقافت و تعلیم اور فاس کی قَرَویّین یونیورسٹی[1] نے مل کر کیا تھا۔ کانفرنس کی صدارت مراکش کے وزیر ثقافت و تعلیم اور قَرَویّین یونیورسٹی کے سابق چانسلر استاذ محمد الفاسی نے کی۔ کانفرنس نے اپنی سات روز کی کارروائی میں اسلامی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر غور کیا جن میں سرِ فہرست مسئلہ ایک ایسے نصابِ

---

[1] قَرَویّین یونیورسٹی ۲۴۵ھ میں قائم ہوئی۔ یہ یونیورسٹی مصر کی ازہر یونیورسٹی سے ایک سو سال پرانی ہے۔ اس کی تاسیس کا سہرا ایک خاتون فاطمہ بنت محمد الفِہری کے سَر ہے۔ قیروان سے جو مسلمان خاندان ہجرت کر کے فاس میں آباد ہو گئے تھے یہ خاتون بھی ان میں شامل تھیں۔ چنانچہ قیروانی مہاجروں کی نسبت سے اس یونیورسٹی کو بھی قَرَویّین یونیورسٹی کہا گیا۔ ابنِ بطوطہ، ابن رُشد، ابن خَلدون اور الشریف ادریسی نے اسی یونیورسٹی میں تعلیم پائی ہے۔ یہ یونیورسٹی پہلے ایک جامع مسجد میں قائم تھی جو فاس شہر کی قدیم آبادی کے عین درمیان میں واقع ہے۔ مگر اب اس یونیورسٹی کے تین کالج تین مختلف شہروں میں قائم ہیں۔ شریعت کالج فاس میں ہے اور فاس کی جدید آبادی کے یونیورسٹی کیمپس (الحی الجامعی) میں واقع ہے۔ آرٹس کالج رباط میں ہے اور الٰہیات کالج تطوان میں۔ اس یونیورسٹی کے تحت اِس وقت ۱۳ ثانوی اسکول چل رہے ہیں جن میں ہزارہا طلبہ زیرِ تعلیم ہیں۔ صرف فاس کے ثانوی اسکول میں ۲ ہزار طالب علم ہیں۔ ان میں ۹۰ طالب علم مختلف افریقی ملکوں سے تعلق رکھتے ہیں اور وظیفے پر تعلیم حاصل کر رہے ہیں مثلاً سینی گال، ٹوگو، گینڈ

تعلیم کی ترتیب کا تھا جو اُونچی جماعتوں کے لیے موزوں و مناسب ہو۔ کانفرنس کی طرف سے تین کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں جنہیں مختلف امُور کے متعلق غور و فکر کرنے اور اپنی رپورٹ پیش کرنے کا موقع دیا گیا۔ ان میں سے ایک نصاب کمیٹی تھی، دوسری ثقافت کمیٹی اور تیسری انتظامی امُور کی کمیٹی۔ ان تینوں کمیٹیوں نے کانفرنس کے اجلاس عام میں اپنی اپنی رپورٹیں پیش کیں جنہیں جزوی ترمیم کے ساتھ کانفرنس نے منظور کر لیا۔

اِس کانفرنس کو اسلامی یونیورسٹیوں کی تاسیسی کانفرنس کا نام دیا گیا ہے اور کانفرنس کی طرف سے ایک مستقل تنظیم قائم کر دی گئی ہے جس کا نام ہے جمعیۃ الجامعات الاسلامیہ: (اسلامی یونیورسٹیوں کی ایسوسی ایشن)۔ اس ایسوسی ایشن کا ہر سال ایک اجلاس خاص میں ہُوا کرے گا اور ہر تیسرے سال عام کانفرنس منعقد ہُوا کرے گی جو ایسوسی ایشن کا از سرِ نو انتخاب کیا کرے گی۔ موجودہ ایسوسی ایشن بارہ ارکان پر مشتمل ہے جو ذیل کے ملکوں سے لیے گئے ہیں: پاکستان، بھارت، ملائشیا، ترکی، فلپائن، مصر، اُردن، تونس، شام، نائیجیریا، کینیا، مراکش۔ ایسوسی ایشن کا سالِ رواں کا بجٹ ایک لاکھ ۳۰ ہزار ڈالر طے کیا گیا ہے۔ بجٹ کا ایک حصہ ایسوسی ایشن کے ارکان ادا کریں گے۔

نصاب کے علاوہ کانفرنس نے ایک اعلیٰ پیمانے کے ریسرچ سنٹر کا قیام اور ایک علمی مجلہ کے اجرا کا فیصلہ کیا ہے۔ اِسی طرح کانفرنس کی طرف سے مستحق مسلمان طلبہ کو وظائف دینے کا بھی فیصلہ کیا ہے۔ چنانچہ سالِ رواں کے لیے بارہ وظائف کا اعلان کیا گیا ہے۔ یہ وظائف لینے والے طلبہ قرویین یونیورسٹی میں تعلیم پائیں گے۔

یہ بات بڑی مسرت افزا ہے کہ اس وقت عالمِ اسلام کے ہر گوشے میں اسلامی نظامِ تعلیم کے قیام کی آواز اُٹھ رہی ہے۔ اور ہر ملک میں ایسے عناصر موجود ہیں جو اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے کوشاں ہیں۔ مراکش کی تعلیمی کانفرنس کی تہ میں بھی ایسے ہی عناصر کا ہاتھ ہے۔ اور امید ہے کہ یہ کانفرنس اور اس کی قائم کردہ

اور نیچر کے طلبہ تعلیمی کانفرنس کا ایک مقصد قرویین یونیورسٹی کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینا ہے۔ چنانچہ یہ یونیورسٹی کانفرنس کے فیصلوں پر سب سے پہلے عمل درآمد کرے گی۔

ایسوسی ایشن آگے چل کر اسلامی تعلیم کے میدان میں مفید اور قابلِ قدر خدمات سرانجام دے گی۔

اس کانفرنس میں مندوبین کی طرف سے تعلیم و تربیت اور دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں متعدد اسکیمیں اور تجویزیں پیش کی گئیں۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی نے بھی اپنی اُس اسکیم کو پیش کیا جو مولانا محترم مدینہ یونیورسٹی کی تاسیس کے موقع پر پیش کر چکے ہیں اور جو دنیا کے اہلِ علم و رائے حضرات کی طرف سے نہایت پُرجوش دادِ تحسین حاصل کر چکی ہے۔ علاوہ ازیں مولانا محترم نے تعلیمی نصاب وضع کرنے والے حضرات کے سامنے غور و خوض کے لیے مختصراً چار بنیادی نکات پیش کیے جو حسب ذیل ہیں:

۱۔ ہمیں صرف مختلف علوم و فنون کے ماہرین ہی درکار نہیں ہیں بلکہ ایسے ماہر درکار ہیں جو اپنی فکر اور اخلاق کے لحاظ سے مومن اور مسلم ہوں اور ہماری زندگی کے سارے شعبوں کو اسلام کے مطابق چلا سکیں۔ اسلامی تعلیم کا یہ تصور صحیح نہیں ہے کہ اس کو محض تفسیر و حدیث اور فقہ کی اختصاصی تعلیم تک محدود رکھا جائے۔ دراصل ہمیں اُن تمام علوم کو جنہیں دنیوی علوم کہا جاتا ہے، مسلمان بنانا چاہیے اور ان سب کے اندر اسلامی روح اور فکر داخل کرنی چاہیے۔ ہمیں محض ڈاکٹر، طبیب، انجینئر، سائنس دان، اور علوم عمرانیہ کے ماہرین درکار نہیں ہیں بلکہ ایسے ماہرینِ علوم درکار ہیں جو اپنی سوچ اور اپنی ذہنیت کے لحاظ سے اور اپنی عملی زندگی کے لحاظ سے مسلمان بھی ہوں۔ اس غرض کے لیے تمام علوم کی تعلیم میں اسلام کو ایسے طریقے پر داخل کرنے کی ضرورت ہے جس سے اسلامی فکر ان کے ذہن پر غالب ہو سکے اور وہ علوم عصریہ کو پڑھتے ہوئے مغرب کی الحادی فکر سے مرعوب نہ ہوں۔

۲۔ دوسرا اہم مسئلہ اخلاقی تربیت کا ہے جو اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ نہ ہو تو محض فکری مسلمان عملی مسلمان نہیں بن سکیں گے اور عمل و فکر کا تضاد اپنے بُرے اثرات دکھاتا رہے گا۔

۳۔ تیسرا اہم کام مستشرقین کے فتنے کا مقابلہ کرنا ہے جن میں یہود اور نصاریٰ کے وہ تینوں عناصر شامل ہیں جو یا تو سیاسی اغراض رکھتے ہیں یا مشنری اغراض یا پھر مسلمانوں میں الحاد پھیلانا چاہتے ہیں۔ یہ سب مل کر تحقیق کے نام سے اسلامی تاریخ اور علومِ دینیہ اور اسلامی نظریات کی شکل بگاڑنے میں لگے ہوئے ہیں۔ اسلامی دنیا کے بکثرت تعلیمی اداروں میں ان کی نام نہاد تحقیقات پڑھائی جا رہی ہیں اور ان میں جو خطرناک فتنے

چھپے ہوتے ہیں ان سے ہماری نئی نسلیں متاثر ہوتی جارہی ہیں۔ ان سے خبردار کرنے والا لٹریچر مسلمانوں کی طرف سے بہت کم تیار کیا گیا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ متعلمین ہی نہیں بلکہ معلّمین تک ان سے دھوکا کھا رہے ہیں۔

۴۔ چوتھی اہم چیز جس کی طرف توجہ کرنے کی خاص ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ تمام مسلمان ملکوں کے ہزاروں نوجوان اس وقت امریکہ اور یورپ اور روس کی جامعات میں جا رہے ہیں اور ان کی دینی اور اخلاقی تعلیم وتربیت کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ یہی لوگ واپس آکر مسلمان ملکوں میں اہم مناصب پر فائز ہوتے ہیں اور ان کی کثیر تعداد کے اخلاق و افکار دونوں اسلام کی راہ سے منحرف ہو چکے ہوتے ہیں۔ اس کے لیے بہر حال ایسی تدابیر سوچنی چاہییں کہ ان ممالک میں جانے والے مسلمان نوجوانوں کے دین و اخلاق کی حفاظت کی جا سکے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے ان کا جانا تو بہر حال ناگزیر ہے۔ لیکن ہمارے لیے اس نقصان کو برداشت کرنا مشکل ہے کہ ہمارے سب سے زیادہ کار آمد نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنی فکر و اخلاق کے لحاظ سے ہم سے بیگانہ ہو جائے اور دوسروں کے رنگ میں رنگ جائے۔"

کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں مولانا مودودی مدظلہ العالی نے کانفرنس کے فیصلوں اور قراردادوں کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے پہلے حکومت مراکش کو مبارکباد دی کہ اس نے تعلیمی کانفرنس کا اہتمام کرکے ملتِ اسلامی کے بہی خواہ افراد کی قدیم خواہش کی تکمیل کی ہے۔ اور اس کے بعد اس امید کا اظہار کیا کہ انشاء اللہ یہ کانفرنس اور اس کی مستقل ایسوسی ایشن اسلامی نظامِ تعلیم کو برپا کرنے کے راستہ کا پہلا مفید قدم ثابت ہو گی۔ مولانا محترم نے واضح کیا کہ جب تک ہم صحیح اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے اُس وقت تک موجودہ نسل کو الحاد اور خدا بیزار نظریات کے چنگل سے آزاد کرانا اور اُسے اسلامی معاشرے کی طرف سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کی اہل بنانا ناممکن ہے۔ مولانا محترم نے توجہ دلائی کہ کانفرنس کے فیصلوں کو جلد از جلد عملی جامہ پہنایا جائے۔ اس لیے کہ اصل چیز اسکیموں کی تیاری نہیں ہے بلکہ ان کی تنفیذ ہے۔"

آئندہ صفحات میں ہم مراکش کی تعلیمی کانفرنس کی کارروائی کے ضروری حصے پیش کر رہے ہیں۔ امید ہے ترجمان القرآن کے قارئین کے لیے یہ دلچسپی کا موجب ہوں گے۔

کانفرنس کے مندوبین

کانفرنس میں شرکت کرنے والے افراد اور اداروں کی تفصیل یہ ہے:

۱۔ مراکش:

محمد الفاسی، وزیر ثقافت و تعلیم مراکش

عبدالسلام الفاسی، چانسلر قرویین یونیورسٹی، فاس

الجواد الصقلی، وائس چانسلر قرویین یونیورسٹی، فاس

حسن سائح، نمائندہ وزیر ریاست عبدالہادی بوطالب، رباط

سعید العلوی، صدر مجلس علمی تارودانت

مصطفیٰ العلوی، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسلامک سٹڈیز، رباط

عابد الفاسی، پروفیسر شریعت کالج و دار الحدیث الحسنیہ، فاس

علال الفاسی، صدر استقلال پارٹی و پروفیسر لا کالج محمد الخامس یونیورسٹی، رباط

استاذ عبداللہ کنون، صدر رابطۃ العلماء مراکش، طنجہ

ابراہیم الکتانی، صدر شعبہ مخطوطات عربیہ، پبلک لائبریری، رباط

احمد بن شقرون، وائس پرنسپل شریعت کالج قرویین یونیورسٹی، فاس

اساتذہ قرویین یونیورسٹی۔

۲۔ الجزائر:

عبدالمجید الشریف، ڈائرکٹر شعبۂ تربیت دینی، وزارت اوقاف، الجزائر

۳۔ تونس:

فاضل بن عاشور، پرنسپل شریعت کالج۔ زیتونہ یونیورسٹی، تونس

۴۔ مصر: شیخ بدر المتولی عبدالباسط۔ پرنسپل شریعت کالج، ازہر یونیورسٹی، قاہرہ

ڈاکٹر محمد نائل ، پرنسپل آرٹس کالج ، ازہر یونیورسٹی ، قاہرہ

ڈاکٹر زکی محمود شبانہ ، پرنسپل اگریکلچرل کالج ، عین شمس یونیورسٹی ، اسکندریہ

ڈاکٹر عائشہ عبدالرحمان (بنت الشاطیؒ) صدر شعبہ عربی و اسلامیات ، عین شمس یونیورسٹی

۵۔ شام :

عبدالرحمن صابونی ، پروفیسر شریعت کالج ، دمشق

۶۔ اُردن :

ڈاکٹر عبدالعزیز خیاط ، ڈائرکٹر ادارہ تربیت اسلامیہ ، عمان

۷۔ عراق :

جمیل سعید سالم ، صدر شعبہ عربی بغداد یونیورسٹی

عمر فلا حویش ، پروفیسر امام اعظم کالج ، بغداد

تقی الدین الحکیم ، پرنسپل الٰہیات کالج ، نجف اشرف

سید ہادی فیاض ، صدر انجمن نشریات اسلام ،

۸۔ ایران :

ڈاکٹر محمد المحمدی ، پرنسپل الٰہیات و تعلیمات اسلامیہ کالج ، طہران

۹۔ سینی گال :

الحاج ابراہیم نیاس ، شیخ الاسلام سینی گال

۱۰۔ مالی :

سید بابا محمود حاسی ، ناظم اسلامی درسگاہ ، ٹمبکٹو

۱۱۔ نائیجیریا :

ڈاکٹر حمید وکالی ، پرنسپل عبداللہ باثرو اسلامیہ کالج ، احمدو بیلو یونیورسٹی ، زاریا

۱۲۔ کینیا : محمد ابراہیم ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ہائر اسلامک سٹڈیز ، مجاکوس

۱۳۔ بھارت :

ڈاکٹر عبدالعلیم، وائس چانسلر علی گڑھ یونیورسٹی

۱۴۔ پاکستان :

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی، امیر جماعت اسلامی پاکستان

۱۵۔ ملائیشیا :

عبدالجلیل حسن، پرنسپل اسلامیہ کالج، کوالالمپور

۱۶۔ فلپائن :

احمد الونتو، صدر فلپائن مسلم ایسوسی ایشن و پرنسپل کامل الاسلام کالج، منیلا

کانفرنس میں لیبیا اور سوڈان بھی مدعو تھے۔ چنانچہ لیبیا کی سنوسی یونیورسٹی اور سوڈان کی اسلامی یونیورسٹی اُمِّ دُرمان نے باقاعدہ دعوت قبول کرلی تھی اور نمائندوں کے نام بھی بھیج دیئے تھے۔ مگر یہ دونوں یونیورسٹیاں کانفرنس میں شرکت سے محروم رہیں۔ کیونکہ سوڈان کی نئی اشتراکی حکومت نے اُمِّ دُرمان کی اسلامی یونیورسٹی کو بند کر دیا ہے[۱]۔ اور اسی طرح لیبیا کی انقلابی حکومت نے سنوسی یونیورسٹی کے چانسلر، وائس چانسلر اور دیگر متعدد اساتذہ کو جیلوں میں نظر بند کر دیا ہے۔ سعودی عرب کی مدینہ یونیورسٹی کی عدمِ شمولیت کی وجہ معلوم نہیں ہوسکی۔

اسلامی یونیورسٹیوں کی ایسوسی ایشن کا دستور

کانفرنس نے اسلامی یونیورسٹیوں کی ایسوسی ایشن کے لیے ایک دستور بھی وضع کر دیا ہے۔ یہ دستور ۳ ابواب اور ۸ فصول پر مشتمل ہے۔ دستور کے دیباچے میں کہا گیا ہے :

یہ کانفرنس جو اعلیٰ تعلیم اور اسلامی تعلیم کے اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ہے اس امر کا پورا احساس

---

[۱] سوڈان کی انقلابی حکومت کے اس اقدام کے خلاف ملک کے اندر شدید اضطراب پیدا ہوچکا ہے جس کی وجہ سے انقلابی حکومت اپنے اس فیصلہ پر نظرِ ثانی کر رہی ہے۔

رکھتی ہے کہ اعلیٰ تعلیم اور اسلامی تعلیم کے اداروں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ موجودہ فکری اور ثقافتی حملوں سے امتِ مسلمہ کو محفوظ رکھیں، اس کے تشخص کو قائم رکھیں، عہد حاضر کو اسلامی دعوت کی انسان دوستی سے روشناس کرائیں۔ اور امت کو جس فکری اتحاد کی اس وقت ضرورت درپیش ہے اُسے صحیح اسلامی تعلیم کی بنیادوں پر رُوبکار لائیں۔ کانفرنس کو یہ بھی احساس ہے کہ اسلامی تعلیم کی راہ میں طرح طرح کی مشکلات اور رُکاوٹیں حائل ہیں، اور ساتھ ہی اسے یہ یقین بھی ہے کہ ان مشکلات میں سے اکثر و بیشتر پر قابو پایا جاسکتا ہے بشرطیکہ اسلامی اداروں کے مابین تعاون اور مشاورت کا مضبوط نظام قائم کر دیا جائے۔ چنانچہ یہ کانفرنس مندرجہ بالا احساسات کی روشنی میں ایک مستقل تنظیم بروئے کار لانے کا فیصلہ کرتی ہے جو بطور یہ اغراض و مقاصد کو پورا کرے اور عالمی یونیورسٹیوں کے معیار کے ساتھ ہم آہنگ ہو۔ اس تنظیم کا نام ہم نے "جمعیۃ الجامعات الاسلامیہ" رکھا ہے یعنی اسلامی یونیورسٹیوں کی ایسوسی ایشن۔

مقاصد: ۱۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور اسلامی درسگاہوں کے مابین اتحاد کو زیادہ سے زیادہ تقویت پہنچانے کے لیے تبادلہ، تعاون اور دیگر سرگرمیوں کو ترقی دینا۔

۲۔ قائم شدہ اداروں کی امداد اور حمایت کرنا اور ان کی ضروریات معلوم کرنا اور ان کے وسائل میں ہم آہنگی پیدا کرنا۔

۳۔ اعلیٰ تعلیم اور علمی تحقیقات سے متعلق معلومات جمع کرنا اور پھر انہیں مختلف اداروں تک منتقل کرنا اور اسلام سے متعلق تمام تحقیقات کا ریکارڈ تیار کرنا۔

۴۔ درسی نصاب کی چھان بین اور موازنہ تاکہ مختلف اداروں کی جاری کردہ ڈگریوں کا باہمی تبادلہ کیا جاسکے۔

۵۔ اسلامی تعلیم کے اداروں اور عالمی یونیورسٹیوں کے مابین تعلقات اُستوار کرنا۔

۶۔ دنیائے اسلام میں قرآن کریم کی زبان (عربی) کے استعمال کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینا۔

۷۔ اعلیٰ تعلیم کے اداروں اور اسلامی درسگاہوں کی سطح پر کانفرنسیں اور مجالس مذاکرہ منعقد کرنا۔

۸۔ یونیورسٹی کی سطح کی تعلیم اور اسلامی تحقیقات کے لیے نئے ادارے قائم کرنے کے لیے ضروری مدد

اور تعاون۔

دستور میں ایسوسی ایشن کی رکنیت کی شرائط واضح کردی گئی ہیں۔ اس ایسوسی ایشن کی رکنیت صرف یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک محدود ہوگی۔ جو ادارہ رکنیت کی درخواست پیش کرے اور دستور پر اپنی تصدیق ثبت کردے اور دستور کی پابندی کا اقرار کرے، انتظامی کونسل اُس کی درخواست کو قبول کرے گی اور آخری توثیق کے لیے جنرل کانفرنس میں پیش کرے گی۔ حقوق و فرائض میں تمام ارکان کی یکساں حیثیت ہوگی۔ اگر کوئی رکن ادارہ دستور کی خلاف ورزی کرے یا اپنے ذمہ کے مادی اور اخلاقی واجبات میں کوتاہی کرے تو انتظامی کونسل اُسے رکنیت سے محروم کردے گی مگر آخری فیصلہ کانفرنس کرے گی۔ دستور نے ہر رکن پر سالانہ مالی بوجھ بھی ڈالا ہے

یونیورسٹیوں کی ایسوسی ایشن درج ذیل اداروں پر مشتمل ہوگی:

۱۔ جنرل کانفرنس

۲۔ انتظامی کونسل

۳۔ سکرٹریٹ

جنرل کانفرنس:

جنرل کانفرنس ایسوسی ایشن کا اعلیٰ با اختیار ادارہ ہے۔ اس کے اختیارات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ ایسوسی ایشن کی عمومی پالیسی کا تعین۔ انتظامی کونسل اور سکرٹریٹ اِس پالیسی کے پابند ہوں گے۔

۲۔ ایسوسی ایشن کے پروگرام اور بجٹ کی توثیق۔

۳۔ ایسوسی ایشن کے صدر اور انتظامی کونسل کے ارکان کا انتخاب۔

۴۔ ایسوسی ایشن کے جنرل سکرٹری کی نامزدگی۔

۵۔ انتظامی کونسل کو کسی بھی ایسے کام کا ذمہ دار ٹھیرانا جو ایسوسی ایشن کے اغراض و مقاصد کے مطابق ہو۔

جنرل کانفرنس رکن اداروں کے نمائندوں پر مشتمل ہوگی۔ مبصرین کو کانفرنس میں شرکت کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ ہر رکن ادارے کو ایک ووٹ کا حق ہوگا۔ اور وہی رکن ووٹ دے سکے گا جو کانفرنس

میں موجود ہو گا۔ کانفرنس کم از کم ہر تین سال کے بعد اپنا اجلاس منعقد کرے گی۔ البتہ ایسوسی ایشن کا ہنگامی اجلاس بھی طلب کیا جا سکتا ہے۔ اگر ایسوسی ایشن کے ارکان کی اکثریت یا انتظامی کونسل کے دو تہائی ارکان کی طرف سے اس کا مطالبہ کیا جائے۔ ایسوسی ایشن کے صدر کا انتخاب کانفرنس کے حاضر ارکان کی مطلق اکثریت کی اساس پر ہو گا۔ منتخب صدر کانفرنس کے اگلے اجلاس میں نئے صدر کے انتخاب تک اپنے فرائض سرانجام دے گا۔ ایسوسی ایشن کا صدر ہی انتظامی کونسل کا صدر ہو گا۔ اسی طرح کانفرنس ایسوسی ایشن کا جنرل سکرٹری نامزد کرے گی۔ یہ جنرل سکرٹری ایسوسی ایشن کے علاوہ انتظامی کونسل کا بھی جنرل سکرٹری ہو گا۔ جنرل سکرٹری کو ووٹ دینے کا حق نہیں ہو گا۔ اس کی مدت تین سال کے لیے ہو گی۔

انتظامی کونسل :

انتظامی کونسل صدر اور بارہ ارکان پر مشتمل ہو گی۔ ان ارکان کا انتخاب کانفرنس کرے گی۔ اس بارے میں رکن اداروں کی نمائندگی کا پورا پورا لحاظ کیا جائے گا۔ ایک ملک کے تمام تعلیمی اداروں کے لیے انتظامی کونسل کے اندر صرف ایک نشست ہو گی۔ انتظامی کونسل کانفرنس کے فیصلوں کو نافذ کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔ نیز کانفرنس کا ایجنڈا مرتب کرنا، بجٹ بنانا اور دو اجلاسوں کی درمیانی مدت کے لیے لائحہ عمل تیار کرنا بھی اس کے ذمہ ہو گا۔ انتظامی کونسل کانفرنس کے سامنے جواب دہ ہو گی، اپنی کارکردگی کی رپورٹ اسے پیش کرے گی، سکرٹریٹ کو چلانے اور اس کی سرگرمیوں کی نگرانی کرنے کی ذمہ دار ہو گی۔ انتظامی کونسل کا سال میں ایک اجلاس ہو گا۔ کونسل کے دو تہائی ارکان کے مطالبے کی بنا پر اس کا ہنگامی اجلاس بھی منعقد کیا جا سکتا ہے۔

سکرٹریٹ :

سکرٹریٹ ایسوسی ایشن کی انتظامی مشینری ہو گی۔ یہ مشینری انتظامی کونسل اور جنرل سکرٹری کی نگرانی میں کام کرے گی۔ سکرٹریٹ کا فرض ہو گا کہ وہ :

اعلیٰ تعلیم اور اسلامی یونیورسٹیوں کے مسائل سے متعلق معلومات اور دستاویزات کا ایک مرکز قائم کرے۔ اور رکن اداروں اور دوسرے اربابِ تحقیق کو ان معلومات اور دستاویزات سے استفادہ کا موقع فراہم کرے۔ عالمِ اسلامی میں اعلیٰ تعلیم کے متعلق ضروری اعداد و شمار جمع کرنا اور انہیں چھان بین کے بعد شائع کرنا۔

طلبہ اور اساتذہ کے باہمی تبادلے کے لیے سہولتیں پیدا کرنا اور اس غرض کے لیے جگہ جگہ دفاتر قائم کرنا۔ اعلیٰ تعلیم کے اساتذہ کی فراہمی اور ان کے لیے موزوں ملازمت کے سلسلے میں مساعی کو منظم کرنا اور ترقی دینا۔ رکن اداروں کے مابین تعاون کو زیادہ سے زیادہ آسان کرنا، تاکہ ان کی افادیت کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جاسکے۔ رکن اداروں کو اگر خصوصی خدمات کی ضرورت ہو تو ان کی سبیل پیدا کرنا۔

دستور میں قانون اساسی کے اندر تغیر و تبدل کے لازمی قواعد بیان کر دیئے گئے ہیں۔ اور یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ اگر ایسوسی ایشن کے دو تہائی ارکان ایسوسی ایشن کو ختم کر دینے کا مطالبہ کریں گے تو اسے ختم کیا جائے گا اور اس کی املاک کسی اور ایسے ادارے کی تحویل میں دے دی جائیں گی جو انہی مقاصد کے لیے کام کر رہا ہو گا۔

کانفرنس نے آئندہ تین سالوں کے لیے مراکش کے وزیر ثقافت و تعلیم استاذ محمد الفاسی کو ایسوسی ایشن کا صدر منتخب کیا ہے۔ موصوف انتظامی کونسل کے بھی صدر رہیں گے۔ انتظامی کونسل کا اجلاس ہر سال ماہ ستمبر میں منعقد ہو گا۔ فاس کی قرویین یونیورسٹی کو ایسوسی ایشن کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔

اسلامی تعلیم کا نصاب

اسلامی تعلیم کا یہ نصاب، اس کمیٹی نے وضع کیا ہے جو اس کام کے لیے کانفرنس نے مقرر کی تھی۔ نصاب کمیٹی کے پہلے اجلاس کے صدر شیخ فاضل بن عاشور (تونس) تھے۔ مگر بعد میں شریعت کالج ازہر یونیورسٹی کے پرنسپل شیخ بدر المتولی عبد الباسط پہنچ گئے تو فاضل بن عاشور اُن کے حق میں صدارت سے دستبردار ہو گئے چنانچہ کمیٹی کے اگلے تمام اجلاس شیخ بدر کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ کمیٹی نے اسلامی یونیورسٹیوں کے موجودہ نصاباتِ تعلیم کا جائزہ لیا اور پھر خود ایک نصاب تجویز کیا جو اسلامی یونیورسٹیوں اور اعلیٰ تعلیم کے اسلامی اداروں میں پڑھایا جانا چاہیے۔ یہ نصاب بیس مضامین پر مشتمل ہے۔ اور اس کی مدت چار سال رکھی گئی ہے۔ چار سال کے بعد طالب علم کو جو ڈگری دی جائے گی وہ بی اے کی ڈگری کے مماثل ہو گی۔

نصاب کی تفصیل یہ ہے :

علومِ اسلامیہ

الف : قرآن (۱) قرآن کریم کی تفسیر۔ (۲) مختلف موضوعات پر قرآن کی تعلیمات۔ (۳) قراءات۔
ہر کالج یا ہر شعبے کے اندر قراءت کے ضروری حصے پڑھائے جائیں۔ اور کوشش کی جائے
کہ قراءت میں تخصص کے لیے الگ ادارے قائم کیے جائیں۔

ب : حدیث (۱) حدیث کی مکمل تدریس درایت و روایت دونوں پہلوؤں سے۔ (۲) مختلف موضوعات
پر الگ الگ حدیث کی تعلیمات و احکام۔ (۳) اصطلاحاتِ حدیث اور علم الرجال۔
(۴) سیرت اور فقہ سیرت۔

ج : عقاید : عقاید کے بارے میں ایک آسان اور عام فہم کتاب جو پیچیدہ بحثوں سے خالی ہو۔

د : فقہ (۱) فقہ (مسائل و احکام کی تدریس بسط و تفصیل کے ساتھ)، نیز فقہ کا تقابلی مطالعہ ہر مذہب
کی امہاتِ کتب سے اخذ و استفادہ کے ساتھ۔ (۲) اسلامی نظام (دستوری، سیاسی
اور اقتصادی اور معاشرتی تعلیمات، فقہ اسلامی کی روشنی میں۔ (۳) اصولِ فقہ۔
(۴) اسلامی قانون سازی کی تاریخ (۵) قواعد کلیہ اور مقاصدِ شریعت۔

علومِ اجتماعیہ

(۱) اسلام کا نظامِ تربیت یا اسلام کا فلسفۂ اخلاق (۲) اسلامی تہذیب۔ (۳) اسلامی تاریخ جس میں عہدِ حاضر کی مکمل تاریخ اور مسلمان اقوام کے موجودہ سیاسی اور اجتماعی حالات کا مطالعہ بھی شامل ہے۔ (۴) مسئلہ فلسطین کی تدریس اسلامی تعلیم کی روشنی میں۔

عربی زبان

بقدرِ امکان اساسی تعلیم کے لیے عربی زبان کو ذریعۂ تدریس بنایا جائے۔ یا پھر لازمی طور پر عربی زبان کی تدریس کا انتظام کیا جائے اور اس غرض کے لیے عربی زبان کی قدیم کتابوں کو پڑھایا جائے۔ صاحبِ فضل اساتذہ لیکچروں کا طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہیں۔ مگر قدیم مآخذ سے رجوع لازمی ہے کیونکہ یہی مآخذ طالب علم کے اندر صحیح اور مضبوط ملکہ پیدا کر سکتے ہیں۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے اساتذہ کی فراہمی کا مسئلہ

اس موضوع پر کمیٹی میں طویل بحث وتمحیص کی گئی۔ شیخ فاضل بن عاشور نے بتایا کہ اعلیٰ تعلیم کے ماہرین ختم ہوتے جا رہے ہیں اور ضرورت اس امر کا تقاضا کر رہی ہے کہ ان کے جانشین فراہم کیے جائیں۔ اس غرض کے لیے ذیل کی چیزوں پر اتفاق رائے ہوا:

۱۔ موجودہ اساتذہ اور ماہرین سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا جائے اور انہوں نے اپنے تجربہ وبصیرت سے اسلامی علوم میں جو نظر پیدا کر لی ہے اُس سے پُورا پُورا اکتساب کیا جائے۔ نیز انہیں وہ تمام حقوق دلوائے جائیں جو دوسرے اعلیٰ تعلیم کے ماہرین کو از روئے قانون حاصل ہیں۔

۲۔ تعلیمی میدان میں کام کرنے والے افراد میں سے ممتاز اور نمایاں اساتذہ کو چُن لیا جائے اور اُن کی اقدمیت اور قابلیت کو ہی تخصص کی ڈگری کا درجہ دیا جائے۔ ایسے اساتذہ کا انتخاب یونیورسٹی کا سینیٹ کرے گا اور اُن کے حقوق کی نگہداشت کرے گا۔

اچھے اور فاضل اساتذہ کی تیاری کے لیے کمیٹی نے ذیل کا طویل المیعاد منصوبہ تجویز کیا ہے:

۱۔ جن اسلامی اداروں اور کالجوں کے اندر تخصص کی تعلیم کا انتظام نہ ہو وہاں یہ انتظام کیا جائے۔
۲۔ کسی طالب علم کو تخصص کے درجہ میں داخل کرنے کے لیے خوب چھان بین اور دقتِ نظر سے کام لیا جائے۔
۳۔ ڈپلوما کی عملی تعلیم دو سال سے کم نہ ہو۔ مقالہ خصوصی کی تیاری اس کے علاوہ ہے۔ طالب علم کا ادارے سے انتساب کافی نہیں ہے۔ بلکہ باقاعدہ وہ ہمہ وقتی داخلہ لے۔
۴۔ ڈپلوما کے امتحانات میں نرمی سے کام نہ لیا جائے اور ایک مضمون کے اندر کمزوری امیدوار کے فیل ہو جانے کے لیے کافی سمجھی جائے۔

مقالہ خصوصی کی تیاری کے لیے ذیل کی شرائط کی پابندی کی جائے:۔

۱۔ مقالہ خصوصی (ڈاکٹریٹ) کی مدت دو سال سے کم اور پانچ سال سے زیادہ نہ ہو۔
۲۔ امیدوار کم از کم ایک سال لازماً اپنے نگران استاذ کے پاس رہے۔
۳۔ اگر کوئی مقالہ متعدد مباحث پر مشتمل ہو تو ہر بحث کے لیے الگ نگران استاذ تجویز کیا جاسکتا ہے۔

۴ - نگران استاذ یہ رپورٹ پیش کرے کہ آیا امیدوار کا مقالہ قابلِ بحث ہے۔

۵ - مقالہ کے بارے میں فیصلہ صادر کرنے والی کمیٹی نگران استاذ کے علاوہ کم ازکم دو اور اساتذہ پر مشتمل ہو۔

۶ - اس کمیٹی میں ایک استاذ متعلقہ کالج یا تعلیمی ادارے سے باہر کا ہو۔

تجربات، نصاب، اساتذہ اور طلبہ کا باہم تبادلہ:

کمیٹی نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ تعلیمی اداروں کے ساتھ اساتذہ اور لیکچرز اور طلبہ کا تبادلہ دَوروں کے ذریعہ ہوتا رہنا چاہیے اور زائر اساتذہ اور خصوصی لیکچروں کے نظام کو زیادہ سے زیادہ توسیع دی جائے۔ اسی طرح نصاب اور تعلیمی تجربات کا باہم تبادلہ ہونا چاہیے۔ یہ تبادلہ مجلسِ انتظامی کے توسط سے ہو۔

بنیادی زبانوں کی تعلیم:

ہر تعلیمی ادارے اور کالج کو ایک غیر ملکی زبان کی تعلیم کا اہتمام کرنا چاہیے جس کے مبادیات طالب علم نے کالج کی تعلیم سے پہلے ثانوی درسگاہ کے اندر حاصل کر لیے ہوں۔ غیر ملکی زبان کے ہفتہ وار اوقات کا تعین ہر کالج یا ادارہ اپنے ہاں کے حالات کے تحت کر سکتا ہے لیکن بہرحال کسی زبان کی تدریس کے مطلوبہ نتائج حاصل کرنے کے لیے جن اقدامات کی ضرورت ہے وہ لازماً اختیار کیے جانے چاہییں۔

نصاب کمیٹی نے ذیل کی سفارشات تجویز کی ہیں:

۱- غیر شرعی کالجوں کے اندر شریعتِ اسلامی کی ابتدائی تعلیم دی جائے تاکہ طالب علم کا اپنے دین اور اپنی اسلامی ثقافت سے تعلق نہ ٹوٹنے پائے۔

۲- اسلامی کالجوں میں غیر اسلامی مضامین کی تدریس کے لیے جس استاذ کو مقرر کیا جائے اُس کے انتخاب میں اس امر کا شدید لحاظ رکھا جائے کہ وہ اپنے عقیدہ اور عمل میں کسی گمراہی کا شکار نہ ہو۔

۳- کالجوں کے اندر اسلامی فضا پیدا کی جائے تاکہ طلبہ اپنے دین کے ساتھ وابستہ رہ سکیں۔ نیز طلبہ کی نگرانی اور رہنمائی کرنے والے حضرات یہ کوشش کریں کہ طلبہ کے فرصت کے اوقات کو ایسے مشاغل سے پُر کریں جو کالج کی اصل غرض و غایت کی تکمیل میں مدد دیں۔

۴ - دعوت و تبلیغ کے شعبوں کے بارے میں کانفرنس نے یہ سفارش کی ہے کہ ان میں مسلمان اقوام

کی مختلف زبانوں کی تعلیم دی جاتے تاکہ مبلغین اپنے مشن کو بوجہِ اَتم سرانجام دے سکیں۔

۵۔ ڈگریوں اور اَسناد کے تبادلہ اور یکسانیت کے بارے میں کانفرنس کی یہ سفارش ہے کہ جن اسلامی اداروں کا نصاب اور تعلیمی معیار ملتا جلتا ہوگا اُن کی ڈگریاں اپنی اپنی سطح پر ان اداروں میں قابلِ قبول ہوں گی۔ (باقی)

تصحیح

تفہیم القرآن جلد اوّل آفسٹ ایڈیشن میں حسبِ ذیل مقامات پر غلطیاں پائی گئی ہیں، ان کی تصحیح کرلی جائے:

صفحہ ۱۴۷۔ سطر ۲۔	غلط	يُبَيّنُ	صحیح	يُبَيِّنُ
صفحہ ۳۶۹۔ سطر ۳	غلط	مِنْهُمْ	صحیح	مِنْهُمْ
صفحہ ۳۹۴۔ سطر ۱	غلط	اَرٰىكَ	صحیح	اَرٰىكَ

تفہیم القرآن جلد چہارم، صفحہ ۲۵، سطر ۷ میں حسبِ ذیل اصلاح کرلی جائے:

غلط	صحیح
موج پہاڑوں کی طرح	موج سائبانوں کی طرح

علمائے مراکش کے سوالات

["رابطۃ العلماء" مراکش کے علماء اور مذہبی رہنماؤں کی تنظیم ہے۔ اس کے سربراہ مراکش کے نامور عالمِ دین اور ادیب شہیر استاذ عبداللہ کنون ہیں۔ طنجہ میں اس تنظیم کا مرکز ہے اور ملک کے مختلف حصّوں میں اس کی شاخیں قائم ہیں۔ مراکش کے تمام دینی حلقے بلا استثناء اس تنظیم سے وابستہ ہیں۔ "المیثاق" کے نام سے اس کا ایک ہفتہ وار اخبار طنجہ سے نکلتا ہے۔ رابطۃ العلماء کا ایک وفد سکرٹری جنرل شیخ ابن سعید العلوی کی قیادت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مدظلہ العالی سے ۱۲ ستمبر ۶۹ء کو ملا۔ اس وفد کی طرف سے مولانا محترم کی خدمت میں ایک سوالنامہ پیش کیا گیا۔ یہ سوالنامہ اور مولانا محترم کے جوابات قارئین ترجمان القرآن کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

غ ح]

سوال۔ آپ ہمیں جماعت اسلامی پاکستان کے بارے میں کچھ بتائیں۔

جواب۔ جماعت اسلامی کو قائم ہوئے ۲۸ سال ہو چکے ہیں۔ اس جماعت کا مقصد اسلام کو اس کی پوری شکل اور رُوح کے ساتھ زندگی کے ہر پہلو میں قائم کرنا ہے، خواہ اس کا تعلق عقائد و عبادات سے ہو، یا اخلاق اور معاشرت سے، یا تمدّن و تہذیب سے، یا سیاست اور معیشت سے، یا صلح و جنگ سے۔ ہم دین کو ایک پُورا نظامِ زندگی سمجھتے ہیں۔ اسے اجزاء میں تقسیم نہیں کرتے اور اس کے کسی شعبے کو دوسرے شعبے کی بہ نسبت کم قدر و قیمت کا حامل نہیں مانتے۔ اس دین کو پُوری طرح قائم کرنے کے لیے جماعت اسلامی ہر میدان میں کام کر رہی ہے۔ وہ عقاید اور اعمال و اخلاق کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں ہے، سیاسی نظام کی اصلاح کی کوشش بھی کر رہی ہے اور اسلامی قانون کو نافذ کرنے کے لیے تمام ممکن تدابیر

عمل میں لا رہی ہے۔

سوال۔ کیا پاکستان میں اور بھی اسلامی تحریکیں ہیں؟ اور کیا ان کے درمیان تعاون و یک جہتی ہے؟

جواب۔ دوسری اسلامی تحریکیں بھی پاکستان میں کام کر رہی ہیں۔ ایک تحریک علماء میں کام کر رہی ہے جس کا نام اتحاد العلماء ہے۔ ایک اور تحریک طلبہ میں کام کر رہی ہے جس کا نام اسلامی جمعیت طلبہ ہے۔ ایک اور تحریک کسانوں میں کام کر رہی ہے جس کا نام کسان بورڈ ہے۔ ایک اور تحریک مزدوروں میں کام کر رہی ہے جس کا نام لیبر آرگنائزیشن ہے۔ جماعت اسلامی کا اب ان سب کے ساتھ بہت گہرا تعاون ہے۔ اس کے علاوہ متعدد سیاسی جماعتیں ملک میں قائم ہیں جو اپنا مقصد جمہوریت اور اسلامی نظام کا قیام قرار دیتی ہیں۔ سیاسی میدان میں جماعت اسلامی اور ان کے درمیان تعاون ہو رہا ہے۔ ملک میں علماء کی بھی متعدد جماعتیں ہیں جن میں سے صرف ایک اشتراکیت کی حامی ہے اور ہر معاملہ میں اشتراکیوں کا ساتھ دے رہی ہے۔ باقی تمام جماعتیں ان کی اس پالیسی کی مخالف ہیں، اور علمائے کی عظیم اکثریت اسلامی نظام کے قیام کی خواہاں اور اس کے لیے کوشاں ہے۔

سوال۔ جماعت اسلامی نے کتنی کتابیں شائع کی ہیں اور کتنے اخبارات و رسائل جاری کیے ہیں؟

جواب۔ جماعت اسلامی نے اب تک تقریباً دو سو سے زائد کتابیں شائع کی ہیں جو قریب قریب معاشرے کے ہر عنصر کی ضروریات اور حالات کو پورا کرتی ہیں۔ کچھ اہل علم کے لیے ہیں اور کچھ خاص طور پر جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے لیے۔ کچھ اہل سیاست کے لیے ہیں اور کچھ اہل قانون کے لیے۔ کچھ عوام کے لیے ہیں اور کچھ عورتوں اور بچوں کے لیے۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی کا لٹریچر ۱۹ زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہو رہا ہے جن میں سے تین یورپین زبانیں ہیں، انگریزی، جرمنی، فرانسیسی۔ کچھ ایشیائی زبانیں ہیں، عربی، فارسی، ترکی، انڈونیشی اور جاپانی۔ کچھ افریقی زبانیں ہیں، سواحلی اور ہاؤسا۔ اور باقی برصغیر ہند و پاکستان کی زبانیں ہیں۔ اس کے علاوہ جماعت اسلامی سے تعلق رکھنے والے مختلف لوگ بنگلہ، انگریزی، اردو اور سندھی میں متعدد ہفتہ وار، ماہوار اور دو ماہہ پرچے شائع کر رہے ہیں۔ ایک خاص پرچہ ماہوار عورتوں کے لیے اور ایک ماہانہ بچوں کے لیے ہے۔

سوال ۔ کیا جماعت کے اندر عورتوں کی کوئی تنظیم بھی ہے ۔ اُس کی سرگرمیوں اور طریقِ کار کی کیا تفصیل ہے؟

جواب ۔ جماعت کی ایک شاخ مستقل طور پر عورتوں کے لیے ہے جن کے اجتماعات مردوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں ۔ ان میں عورتیں ہی قرآن و حدیث کا درس دیتی ہیں اور عورتوں میں اشاعتِ دین کا کام کرتی ہیں ۔ مردوں کے اجتماعات میں اگر عورتیں مدعو کی جائیں تو وہ پردے کے پیچھے بیٹھتی ہیں ۔ جماعت سے تعلق رکھنے والی خواتین حجابِ شرعی کی پوری پابندی کرتی ہیں اور بے پردگی کے خلاف مسلسل جدوجہد کر رہی ہیں ۔ ان میں نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین بھی شامل ہیں جن میں سے بعض علومِ عصریہ میں ایم اے ہیں اور بعض ڈاکٹرنیاں بھی ہیں ۔ یہ سب مردوں اور عورتوں کی مخلوط سوسائٹی سے ، اور بے پردگی سے قطعی مجتنب ہیں ۔ وہ غیروں کے سامنے سر اور منہ بھی نہیں کھولتیں جسے عرب ملکوں نے حلال کر رکھا ہے ۔ اس سلسلے میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ پاکستان میں جو عورتیں مغربی تہذیب میں غرق ہو چکی ہیں وہ بھی منی اسکرٹ نہیں پہنتیں اور نہ غسل کے لباس میں علانیہ نہاتی ہیں ۔ پورے پاکستان میں آپ کو ایک مسلمان عورت بھی ایسی نہیں ملے گی جو اسکرٹ استعمال کرتی ہو کجا کہ منی اسکرٹ ۔ بے شک انہوں نے سر کھول دیا ہے اور باہیں بھی برہنہ کر لی ہیں لیکن غنیمت ہے کہ ایران، ٹرکی اور عربی ممالک کی طرح ابھی تک ان کی پنڈلیاں نہیں کھلی ہیں ۔

سوال : کیا حکومت پاکستان دیوانی اور فوجداری معاملات میں اسلامی قانون نافذ کرتی ہے ؟

جواب : نہیں ، انگریزوں کے زمانے میں صرف احوالِ شخصیہ (پرسنل لا) تک اسلامی قانون کا استعمال محدود ہو گیا تھا اور وہی کیفیت اب تک باقی ہے ۔

سوال : آپ نے جن اسلامی ملکوں کا دورہ کیا ہے اُن میں اسلام سے انحراف کس حد تک پایا جاتا ہے ۔ نیز اُس انحراف کو ختم کرنے کا کیا طریقہ ہے ؟

جواب : تمام بلادِ اسلامیہ میں جہاں بھی میں گیا ہوں یا تو اسلام سے کھلا کھلا انحراف پایا جاتا ہے اور اگر اسلام کا اعتقاد اور اس سے محبت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی خواہش موجود ہے تو وہ زبان اور عمل کے تناقض کی شکار ہے ۔ یہی اصل غفلت ہے ۔ اِس حالت کو بدلنے کا طریقہ میرے نزدیک وہی ہے جسے

جماعت اسلامی نے پاکستان میں اختیار کر رکھا ہے۔

سوال۔ وہ کونسا بنیادی طریق کار ہے جسے مسلم اقوام کو اختیار کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنی حکومتوں سے یہ تسلیم کرائیں کہ اسلام دین بھی ہے اور ریاست بھی، عقیدہ بھی ہے اور نظام بھی، مصحف بھی ہے اور سیف بھی؟

جواب: تمام مسلمان قوموں کے لیے لازم ہے کہ وہ اپنی اپنی حکومتوں اور ان کے حکام پر یہ بات واضح کردیں (جس طرح بھی مختلف ملکوں کے حالات میں ممکن ہو) کہ جب تک وہ اسلام کے مطابق کام نہیں کرینگی اس وقت تک ان کو کسی پہلو میں بھی قوم کی تائید حاصل نہ ہو سکے گی۔ کوئی حکومت بھی دنیا میں نہ طاقتور ہو سکتی ہے نہ کامیاب، جب تک اس کی پالیسی قوم کے عقیدے اور ضمیر سے مطابقت نہ رکھتی ہو۔ جو حکومت اپنی قوم کے ضمیر اور عقیدے کے خلاف چلتی ہے اس کی ساری قوتیں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی قوم کے خلاف لڑنے میں ضائع ہو جاتی ہیں اور اس کا کوئی قدم ترقی کی راہ پر آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اس کی نمایاں ترین مثال اسرائیل کے مقابلے میں عرب ریاستوں کی پے در پے شکستیں ہیں جو ۴۸ء سے وہ مسلسل کھا رہی ہیں، حالانکہ اسرائیل میں یہودیوں کی تعداد ڈھائی ملین سے زیادہ نہیں ہے اور عرب ۱۰۰ ملین ہیں۔ اگر اس پر بھی مسلمان حکمرانوں کی آنکھیں نہ کھلیں تو یہ مزید تباہیوں کو دعوت دینے کی ہم معنی ہے۔ اللہ ان لوگوں کو اپنی تائید سے محروم کر دیتا ہے جو اس کی کتاب رکھتے ہوئے بھی اس سے مُنہ موڑ رہے ہوں۔

سوال۔ تعلیمی کانفرنس کی قراردادوں اور فیصلوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب:۔ قراردادیں اور سفارشیں ساری اچھی ہیں۔ مَیں نے خود بھی ان سے اتفاق کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ مَیں نے اپنی آخری تقریر میں کہا ہے، اصل چیز تنفیذ ہے اور ان کی تنفیذ اس کے بغیر نہیں ہو سکتی کہ بلادِ اسلامیہ میں جو لوگ مختلف جامعات کو چلا رہے ہیں ان کے اندر اخلاص اور اسلامی رُوح موجود ہو اور وہ فی الواقع عمل کا ارادہ کریں۔

سوال۔ مسلمان سربراہوں کی کانفرنس کے لیے آپ کونسے بنیادی خطوط تجویز کرتے ہیں جن کی روشنی میں وہ اپنے فیصلے صادر کریں؟

جواب - اس بات کو میں اپنی اس تقریر میں بیان کر چکا ہوں جو سانحۂ مسجد اقصیٰ کے عنوان پر میں نے حال میں کی ہے اور جس کا عربی ترجمہ مراکش کے بعض اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ اب سے دو تین سال پہلے میں نے ۱۳-۱۴ تجاویز اُس وقت پیش کی تھیں جب سومالی لینڈ کے صدر اور شاہ فیصل کی طرف سے مسلم ممالک کے سربراہوں کی کانفرنس منعقد کرنے کی تحریک ہوئی تھی۔ میں نے ان تجاویز میں متعدد ایسے مسائل کی نشان دہی کی تھی جو تمام عالمِ اسلامی کے مشترک مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور جنہیں مسلمان حکومتیں مل کر ہی حل کر سکتی ہیں۔

سوال - شاہ حسن ثانی کے عام موافقت اور خاص طور پر اسلامی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ان کی دعوت کے بارے میں پاکستانی مسلمانوں کے تاثرات کیا ہیں؟

جواب - اسرائیل کے مقابلہ میں عربوں کی شکست کے موقع پر جتنے بیانات بھی عالمِ اسلامی کے اکابر کی طرف سے شائع ہوتے تھے ان میں سب سے زیادہ جس بیان کو پاکستانیوں نے پسند کیا وہ مولائی حسن الثانی کا بیان تھا۔ اور اب پورا پاکستان سربراہوں کی اس کانفرنس کے انعقاد پر شاہ حسن کی تعریف کر رہا ہے اور دعا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس سعی میں برکت عطا فرمائے۔

سوال - عالمِ اسلامی اور علی الخصوص مراکش میں پائے جانے والے اخلاقی انحطاط اور فسق و فجور کے مظاہر کے بارے میں آپ کا کیا تاثر ہے؟

جواب - بلادِ عربیہ اور بعض دوسرے بلادِ اسلامیہ میں عورتوں کی بے پردگی اور بے حیائی کا فتنہ جس حد کو پہنچ گیا ہے اور علانیہ فسق و فجور کے جو مظاہرے ہو رہے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید مسلمان اُس عذاب کو بھی کافی نہیں سمجھتے جو مغربی استعمار کی شکل میں اُن پر نازل ہوا تھا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے کہ اس نے اِس عذاب سے اُن کو نجات دے دی، وہ کسی مزید اور سخت تر عذاب کو دعوت دے رہے ہیں۔ خصوصاً مجھے عربی بولنے والی قوموں پر سخت حیرت ہوتی ہے جن کی زبان میں قرآن نازل ہوا ہے اور جن کی زبان میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کلام فرمایا ہے۔ وہ براہِ راست خود دیکھ سکتے ہیں کہ عورتوں کے متعلق اللہ اور رسول نے کیا ہدایات دی ہیں

غیر عرب مسلمان تو پھر بھی یہ عذر پیش کر سکتے ہیں کہ وہ قرآن و حدیث کی زبان سے ناواقف ہیں۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ اہلِ عرب خدا کے سامنے اس بے حیائی کے لیے کیا عذر پیش کریں گے جو ان کی موجودہ نسل اختیار کر رہی ہے۔

سوال۔ رابطۃ العلماء کے ارکان کے لیے آپ کی نصیحت اور مشورہ کیا ہے؟

جواب: رابطۃ العلماء کو میری نصیحت یہ ہے کہ یا تو وہ خود ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے اٹھیں اور اپنے بل بوتے پر اقامتِ دین کی دعوت اہلِ مراکش کو دیں، یا اگر کسی سیاسی پارٹی کے ساتھ تعاون کریں تو اس شرط کے ساتھ کریں کہ وہ تناقض اور نفاق سے بری ہو کر سیدھا سیدھا اسلام قائم کرنے کے لیے تیار ہو۔ اُس کی پالیسی بنانے میں علماء کو دخیل ہونا چاہیے۔ علماء کی یہ حیثیت نہیں ہونی چاہیے کہ وہ فقط سیاسی پارٹیوں کے دعاگو بن کر رہیں یا اپنے اثر سے مسلمانوں میں اُن کا اعتماد تو قائم کر دیں مگر ان کی پالیسی بنانے میں ان کا کوئی دخل نہ ہو۔ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ علماء علومِ عصریہ سے واقفیت پیدا کریں تاکہ موجودہ نوجوان نسل کو وہ سمجھ سکیں اور ان کی مشکلات کو حل کر سکیں۔ اگر علماء نے اس معاملے میں غفلت برتی تو صرف پرانے طرز کے دیندار اُن کے ساتھ رہ جائیں گے اور نئی نسل کو راہ راست دکھانے میں وہ ناکام ہو جائیں گے۔ علماء کو یہ استعداد اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے کہ وہ نئی نسل کو اپنی بات سمجھا سکیں اور ان کی ذہنیت کے مطابق اُن کی تفہیم کر سکیں۔

مطبوعات

سُرخ اندھیروں میں تالیف جناب خلیل حامدی صاحب ـ شائع کردہ : ۱۳-ای ـ شاہ عالم مارکیٹ لاہور ـ صفحات ۲۱۴ ـ قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۲،۷۵ ـ سستا ایڈیشن ۱،۷۵ ـ

ہمارے اس ملک میں دنیائے اسلام اور خاص طور پر دنیائے عرب کے بارے میں جس قدر ٹھوس معلومات اس کتاب کے فاضل مصنف کو حاصل ہیں اور بہت کم لوگوں کو حاصل ہونگی ـ زیر تبصرہ کتاب میں جناب خلیل حامدی صاحب نے ان بدنصیب مسلمانوں کی حالتِ زار بیان کی ہے جنہیں سرخ سامراج نے تاراج کیا ہے۔ انہوں نے اشتراکی انقلاب کے مختلف مراحل کو بڑے نچے تلے انداز میں بیان کیا ہے ـ اور بتایا کہ اشتراکیت نے

اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے اسلام اور مسلمانوں کا کیا حشر کیا۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ فاضل مصنف نے جو بات بھی اس کتاب میں کہی ہے سند کے ساتھ کہی ہے اور ظلم و ستم کی اس المناک داستان کو مؤرخانہ دیانتداری سے پیش کیا ہے۔ اس ملک کے سارے دینی حلقوں کو اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ اشتراکیت کی ریشہ دوانیوں کو اچھی طرح سمجھا جا سکے اور انہیں معلوم ہو کہ یہ انقلاب اپنے جلو میں کس قسم کی بربادیاں لاتا ہے۔

(بقیہ اشارات)

بھی ایسی نہیں جسے ان کے مابین قدرِ مشترک کہا جاسکے۔ اشتراکیت خدا کے دین کی بہ نسبت سرمایہ داری سے زیادہ قریب ہے اور ان دونوں نظاموں میں سوائے ایک فرق کے یعنی قومی ملکیت، جس کی حیثیت منزلِ مقصود کی نہیں بلکہ تدبیرِ منزل کی ہے، اور قطعاً کوئی فرق نہیں۔ عقائد اور اصولِ تہذیب اور اخلاق اور طرزِ زندگی میں اشتراکی اور سرمایہ دار بالکل ایک جیسے ہیں۔

اسلام کی پوری عمارت اس تصوّر پر قائم ہے کہ اس مادی نظام کی اساس ایک اخلاقی اور روحانی نظام پر رکھی گئی ہے۔ اور یہ مادّی نظام اُسی صورت میں انسان کے لیے مفید اور کارآمد ہوسکتا ہے جب اس سے اِس اخلاقی اور روحانی نظام کے تحت فائدہ اٹھایا جائے۔ انسانی فطرت خود اس بات کی شہادت فراہم کرتی ہے کہ اس عالمِ مجاز کے پسِ پردہ فی الحقیقت ایک روحانی نظام موجود ہے جو اس کے اندر معنویت اور مقصدیت پیدا کرتا ہے۔ انسان کے دل و دماغ میں اپنے آغاز اور انجام کے بارے میں، اس عالمِ محسوسات سے ماوراء حقائق کے بارے میں جو مختلف سوالات ہمہ وقت اُبھرتے رہتے ہیں وہ اس بات کی ناقابلِ تردید شہادت فراہم کرتے ہیں کہ مادّی کائنات اور اس کے محسوس مظاہر کے پسِ پردہ کوئی دوسرا لطیف اور غیر مرئی نظام کارفرما ہے۔

اس اساسی تصوّر کی وجہ سے اسلام نے خدا، آخرت، جنت و دوزخ، وحی و الہام، فرشتے، بغرض سب اَن دیکھے حقائق کو ایمانیات میں شامل کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان ان حقائق کو دل کی گہرائیوں سے پوری طرح قبول نہیں کرلیتا وہ زندگی کے بارے میں صحیح تصوّر قائم نہیں کرسکتا۔ پھر اس اخلاقی نظام سے اسلام میں خیر و شر کے پیمانے متعین ہوتے ہیں اور انسان کے اندر یہ احساس اُبھرتا ہے کہ وہ کسی شے یا فعل کی قدر و قیمت مادّی سُود و زیاں سے جانچنے کے بجائے اس کے اخلاقی اور روحانی پہلوؤں سے متعین کرے۔

اس کے برعکس اشتراکیت کا پورا نظامِ فکر و عمل اس تصور پر قائم ہے کہ یہ عالمِ محسوسات ہی سب کچھ ہے اور زندگی کی ساری قدریں اشیاء اور اعمال کی مادی افادیت سے متعین ہوتی ہیں۔ ان کی اخلاقی اور روحانی اہمیت محض واہمہ ہے۔ مثلاً شراب نوشی سے اگر پیداوار میں اضافہ کیا جاسکے تو اشتراکی نظریہ کے مطابق اس کا استعمال بھلائی کا کام اور اگر اس سے پیداوار کو نقصان پہنچے تو یہ بُرا فعل ہے۔ اس طرح مرد و زن کے آزادانہ اختلاط اور ناچ گانے میں انہماک سے اگر ملکی پیداوار پر بُرا اثر پڑتا ہے تو یہ ناپسندیدہ حرکات ہیں لیکن اگر اس سے مزدور اور کسان تھکاوٹ دُور کر کے زیادہ مستعدی سے کام کر سکیں تو یہ بھلائی کے کام ہیں اور حکومت اور عوام دونوں کو انہیں فروغ دینا چاہیے۔

ان دونوں نظاموں کے اساسی تصورات کے مابین اس واضح اختلاف کو جو لوگ نظر انداز کر کے انہیں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں وہ کبھی بھی صحیح نتائج پر نہیں پہنچ سکتے۔ اشتراکیت کا ابتدائی قدم خواہ بظاہر کتنا ہی بے ضرر بلکہ بعض حالات میں مفید دکھائی دیتا ہو مگر اس کا رُخ لازمی طور پر کفر و الحاد ہی کی طرف ہو گا۔ اور جو کام آغاز میں بھلا معلوم ہو وہ آگے چل کر انسانیت کے خلاف خوفناک سازش کی صورت اختیار کر لے گا۔

دَورِ جدید کا سرمایہ دار واقعی بڑا ظالم ہے۔ اس کے ظلم کا تدارک ضرور ہونا چاہیے۔ مزدور طبقے فی الحقیقت بہت زیادہ ستم زدہ ہیں۔ ان کی داد رسی یقیناً ہونی چاہیے اور انہیں سرمایہ داروں کے مظالم سے نجات ملنی چاہیے۔ جس دل میں اللہ کا خوف اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے وہ انسانیت کی اس ناقابلِ بیان مظلومیت کو آخر کس طرح ٹھنڈے پیٹوں برداشت کر سکتا ہے۔ غریبوں اور بے کسوں کے سب سے بڑے حامی ہمیشہ انبیاء علیہم السلام رہے ہیں۔ اس بنا پر ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس ظلم و استبداد کو برداشت کرنے پر تیار نہیں ہو سکتے جو اس وقت بے کسوں پر کیا جا رہا ہے۔ ہم اس بات کے دل و جان سے متمنی ہیں کہ مزدوروں کو ان کے جائز حقوق حاصل ہوں۔ انہیں آزادی اور فارغ البالی نصیب ہو اور وہ سرمایہ داروں کی زبردست آزاری سے محفوظ و مامون ہوں۔ مگر ہم اس بات کو بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ یہاں مزدوروں کے حقوق کے نام پر کفر آئے۔

غریبوں کی امداد کے آڑ میں یہاں الحاد پھیلایا جاتے۔

ان لوگوں کو غریبوں اور بے کسوں سے فی الواقع کتنی ہمدردی ہے؟ ہم اس کی حقیقت سے بھی پوری طرح واقف ہیں۔ اگر یہ ہمدردی سچی ہوتی تو انہیں سرمایہ دار ممالک کے مزدور کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ روس کے بیگار کیمپ کے ستم کشوں کی مظلومیت کا بھی احساس ہوتا۔ کیا وہ مظلوم اور ستم رسیدہ انسان نہیں جن پر بے پناہ مظالم ڈھائے جا رہے ہیں؟ آخر ان مزدوروں کی مظلومیت اشتراکیوں کے دلوں کے اندر کیوں ارتعاش پیدا نہیں کرتی؟ پھر یہ کس قدر عجیب معاملہ ہے کہ مزدور اور کسان کی ہمدردی کا یہ مروڑ ان لوگوں کے پیٹ میں اٹھ رہا ہے جو خود ہمارے ملک کے بڑے سرمایہ دار اور جاگیر دار ہیں۔ جن کوٹھیوں میں وہ رہتے ہیں، جن ہوٹلوں میں وہ ٹھیرتے ہیں، جن کاروں میں وہ پھرتے ہیں، ان کو دیکھیے اور پھر کسان و مزدور کے غم کو دیکھیے جو ہر وقت ان کی زبان سے تراوش کرتا رہتا ہے۔ پھر ذرا جا کر یہ بھی دیکھیے کہ خود اپنی زمینوں کے کاشت کاروں کے ساتھ، اپنے کارخانوں کے مزدوروں کے ساتھ، اور اپنی کوٹھیوں کے ملازموں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا ہے۔

بھارت کی ہندو اکثریت مسلم اقلیت کے معاملے میں گزشتہ بائیس برس سے جس درندگی کا مظاہرہ کر رہی ہے اس پر جس قدر بھی ماتم کیا جائے کم ہے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۸ء تک مسلمانوں کو ایک ہزار سے زیادہ مرتبہ شدید ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ اور اب ۱۹۶۹ء میں مسلمانوں کے خون سے جو ہولی کھیلی گئی ہے اس کے تصور سے انسانی روح کانپ اٹھتی ہے۔ معصوم اور نہتے انسانوں کا قتلِ عام، ننھی منّی جانوں کی بربادی، عورتوں کی عصمت دری اور ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک، مسلمانوں کی املاک کی تباہی، یہ سب کچھ گھناؤنے جرائم بھارت میں معمولات بن کر رہ گئے ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید وہاں کی اکثریت کے ضمیر نے اس ظالمانہ طرزِ عمل کو پوری طرح قبول کر لیا ہے۔ اس لیے اس کے اندر اس کے خلاف کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے یوں تو متعدد وجوہ ہیں مگر دو وجوہات خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک ہندو قوم کی تنگ نظری اور تعصب جس نے اس قوم کو انسانی بنیادی صفات مثلاً فیاضی، وسعتِ ظرف، رحمدلی سے محروم کر رکھا ہے۔ دوسرے ذات پات کی وجہ سے نسلی برتری اور تفوق کا غلط احساس۔

مسلمانوں کی اس ملک میں سات صدیوں تک مسلسل حکمرانی ایسی چوٹ ہے جسے ہندو آج تک بھلا نہیں سکا۔ اس کے دل میں مسلم قوم کے خلاف آج تک نفرت کی آگ سلگ رہی ہے۔ پھر پاکستان کی صورت میں جو علاقہ اس کے تسلط میں آنے سے بچ گیا ہے اس کا بھی اسے شدید صدمہ ہے۔ اور وہ بار بار اپنی اس ناکامی کا بھگتانوں سے انتقام لینے کے لیے تیار رہتا ہے۔

احمد آباد اور دوسرے علاقوں میں ہندو نے جس وحشت اور بربریت کا مظاہرہ کیا ہے اسے فی الحقیقت اگر درندوں کی طرف بھی منسوب کیا جاتے تو وہ شرم سے اپنا سر جھکا لیں گے اور اس انتساب پر شدید احتجاج کرتے ہوتے چیخ اٹھیں گے کہ ہم درندے ہی سہی مگر ہم اس بھیانک سفاکی سے برات کا اظہار کرتے ہیں۔

ہندو قوم کے اندر اگر کچھ سوچنے سمجھنے والے اہلِ بصیرت موجود ہیں تو انہیں اس زبردست آزاری پر بڑی سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے۔ کمزوروں اور بے کسوں پر ظلم کوئی ایسا کارنامہ نہیں جسے دنیا نے کبھی بھی عزت و احترام کی نظر سے دیکھا ہو یا جسے قدرت نے پسند کیا ہو یا جسے سرانجام دے کر قومیں اقبال مند ہوئی ہوں۔ ظلم ہمیشہ ظالم قوم کی تباہی و بربادی کی علامت ہوتا ہے اور اس تلخ حقیقت کی ناقابلِ تردید شہادت ہوتی ہے کہ اس قوم میں کوئی ایسی انسانی قدر باقی نہیں رہی جس کی بنا پر اُسے دنیا میں زندہ رہنے دیا جائے۔ قومیں ہمیشہ اچھے بنیادی اوصاف سے متصف ہو کر ہی دنیا میں پنپتی ہیں۔ قوموں کی ظالمانہ کارگزاریاں کسی درخشاں باب کا عنوان نہیں بنتیں بلکہ عبرت کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ بھارت کے اربابِ بست و کشاد کو اس مسئلے پر غور کرنا چاہیے کہ کیا وہ اپنی قوم کو سامانِ عبرت کی حیثیت سے دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس موقع پر ہم انسانیت کے دو بڑے "خیر خواہوں" امریکہ اور روس سے بھی یہ پوچھنا چاہتے ہیں

کہ کیا بھارت کے مسلمان انسان نہیں، کیا ان کا قتل ظلم نہیں۔ آخر ان بے بسوں کی بربادی پر ان دونوں خیرخواہوں کے احساسات میں کیوں کوئی تحریک نہیں پیدا ہوتی۔ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ کئی سالوں سے اس خونیں ڈرامہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں اور ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ اسے بھارت کا داخلی معاملہ کہہ کر ان طاقتوں کی معنی خیز خاموشی کے لیے جواز نہیں پیدا کیا جاسکتا کیونکہ ہم نے معمولی معمولی باتوں پر انہیں مختلف ممالک کے داخلی معاملات میں بارہا دخل انداز ہوتے دیکھا ہے۔ عقل یہ بھی باور نہیں کرسکتی کہ امریکہ اور روس بھارت کے سامنے بے بس ہیں۔ وہ بھارت جو اپنے ہر چھوٹے بڑے معاملے کو ان کا اشارہ ابرو پا کر طے کرتا ہے آخر وہ اس معاملے میں انہیں کس طرح نظر انداز کرسکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان دو بڑوں کے سیاسی اور معاشی مصالح پر حق و انصاف کا خون کیا جارہا ہے۔ ان طاقتوں کو بھی اپنے اس غیر اخلاقی، انسانیت کش اور ظالمانہ طرز عمل کے سنگین نتائج پر غور کرنا چاہیے۔

پاکستان پر اس سلسلے میں سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کیونکہ یہ ملک زیادہ تر بھارتی مسلمانوں کی قربانیوں ہی سے معرضِ وجود میں آیا ہے۔ حکومت کو یہ معاملہ بڑے مؤثر انداز میں اقوام متحدہ میں لے جانا چاہیے اور خاص طور پر اسے "معاہدہ نسل کشی" کے تحت جنرل اسمبلی میں اٹھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ساری انسانیت کے ضمیر کو اس ظلم و ستم پر بیدار کرے۔ خصوصاً مسلم ممالک کو بھارتی مسلمانوں کی اس بربادی پر ضرور آگاہ کرنا چاہیے اور انہیں اس صورتِ حال کی سنگینی پر توجہ دلانی چاہیے۔

خالی صفحه

رجسٹرڈ ایل نمبر : ۵۳۴۰
فون نمبر : ۵۲۵۰۷